

## یا قوت

ٹرین کو رحیم پور کا اسٹیشن چھوڑے ہوئے تقریباً بارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ سکندر اور ناملہ کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے کہہ کر پلٹ جاؤں۔ محبت کا یہ رنگ بھی ہو سکتا ہے، مجھے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا، لیکن پھر سلطان بابا کا گہرا سمندر جیسا سکوت اور صبر دیکھ کر میں خود ہی کو ملامت بھی کرتا کہ آخر جو کچھ مجھ پر بنتی ہے وہی سب کچھ ان کے دل نے بھی جھیلنا ہے، لہذا انہیں مزید پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ جانے یہ سب سوچتے سوچتے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر تب جاگا، جب سلطان بابا کی ہلکی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ساحر، میاں اٹھ جاؤ۔۔۔۔۔۔ ہماری منزل آگئی ہے۔“ انہوں نے شاید دھیرے سے میرا کندھا بھی ہلایا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا، لیکن اس وقت صبح سے پہلے کی شدید دھند اور کہر میں ڈوبا ہوا تھا اور اسی دھند میں چلتے پھرتے قلی، ٹھیلے دار اور وینڈنگ کنٹریکٹر سب ہی ایک خواب ہی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ حسب معمول نہ میں نے سلطان بابا سے کوئی سوال کیا اور نہ ہی انہوں نے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ ہم دونوں کے پاس سامان کے نام پر صرف ایک جھوٹا سا چڑے کا بیگ تھا جس میں میرے اور سلطان بابا کے دو جوڑے کپڑے اور ان کا مسواک وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ میں بیگ اٹھائے پلیٹ فارم پر اترا تو سفید وردی میں ملبوس ایک ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں وہاں کھڑا تھا اور اسٹیشن پر لگے بلب کی پہلی روشنی کے دائروں اور سفید دھند کے ہیولوں میں ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی جلدی سے آگے بڑھا اور سلطان بابا سے مخاطب ہوا ”باباجی۔۔۔۔۔ کیا آپ حاجی رزاق صاحب کے مہمان ہیں۔ میں آپ ہی کو لینے کے لیے آیا ہوں۔“ کچھ دیر بعد ہم ڈرائیور کے ساتھ اسی کی دہائی کے ماڈل کی ایک کشادہ مرسڈیز گاڑی میں دھند بھری سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک بہت بڑی حویلی کے بیرونی پھاٹک سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

حویلی بھی کہر میں ڈوبی ہوئی تھی اور مرکزی عمارت کے سامنے اتنا بڑا وسیع اور کشادہ لان تھا، جس میں اس جیسی چار چھ مزید عمارتیں کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ لان کے بیچوں بیچ ایک بہت پرانا ٹیبل کا درخت کچھ عجیب شان بے نیازی سے اکیلا ایستادہ تھا۔ درخت کے چاروں طرف سینٹ کا بڑا سا گول چبوترہ تھا اور اس کی صدیوں پرانی شاخوں کے بیچوں بیچ ایک جھولا بھی لٹکا ہوا تھا۔ حویلی میں داخلے کی روش کو سرخ بجری سے پانا گیا تھا اور یہی روش پورچ سے آگے جا کر انگریزی کے حرف ”ڈی“ کی شکل میں حویلی کے بیرونی گیٹ پر ختم ہوتی تھی۔ داخلے اور بیرونی دونوں گیٹوں پر دربانوں کی موجودگی یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ حویلی کے مکین آنے اور جانے کے دو مختلف گیٹ استعمال کرتے ہیں۔ پورچ میں پہلے ہی سے ایک کچی عمر کا شخص نفیس شیروانی اور سر پر قرآنی پہنے، چند نوکروں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے اترنے پر جب اس نے تعارف اور استقبال کیا تو پتا چلا کہ یہی موصوف حاجی رزاق صاحب ہیں۔ چائے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمیں حویلی کے عظیم الشان ڈرائنگ روم سے باہر لے آئے۔ ان

کی نظر بار بار مجھ پر پڑتی لیکن پھر کچھ پوچھتے پوچھتے رک سے جاتے۔ آخر کار ان کے مہمان خانے کی خوب صورت انکسی میں داخل ہوتے وقت سلطان بابا نے خود ہی ان کی انکھن رفع کر دی۔ ”رزاق صاحب یہ عبداللہ میاں ہیں۔۔۔۔۔ یہ بھی میرے ساتھ ہی رہیں گے۔۔۔۔۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“ حاجی رزاق نے جلدی سے سلطان بابا کی بات کاٹ دی۔ ”نہیں نہیں جناب۔۔۔۔۔ میری کیا مجال کہ میں کوئی اعتراض کروں۔۔۔۔۔ میں بس یہی کفرم کرنا چاہتا تھا کہ صاحب زادے بھی آپ کے ساتھ ہی رہیں گے، یا ان کے لیے کہیں اور بندوبست کرنا ہوگا۔ سوہم اللہ۔۔۔۔۔ آپ کے ساتھ رہیں۔۔۔۔۔ ہمارے سر آنکھوں پر۔۔۔۔۔“ یہ مہمان خانہ، یا انکسی حویلی کی مرکزی عمارت کے داہنی طرف پیردنی گیٹ سے تقریباً متصل واقع تھا اور ہم اس وقت شیشے کی دیوار سے پرے جس برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں سے بھی وہ پینیل کا پیڑ بالکل سامنے نظر آتا تھا۔ حاجی رزاق کی باتوں سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ ان کی سلطان بابا تک رسائی مولوی خضر کے توسط سے ہوئی ہے۔ لیکن ہماری یہاں آمد کا کیا مقصد تھا، یہ عقدہ بھی کچھ دیر میں حاجی رزاق ہی کی زبانی کھلا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے خاندان سمیت ایک مہینہ تینیس دن قبل اس حویلی میں منتقل ہوئے تھے، لیکن ان تین دنوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جو انہوں نے سکون سے گزارا ہو۔ بقول حاجی رزاق، یہ حویلی ان سے پہلے بھی بہت سے خریدار اور کرائے دار دیکھ چکے ہیں، لیکن جانے کیوں، یہاں کوئی بھی چند راتوں سے زیادہ ٹک نہیں پایا۔ حاجی رزاق ایسی باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے اور پھر جب کروڑوں کی یہ جائیداد لاکھوں کے عوض بکنے لگی تو وہ خود کو اسے خریدنے سے باز نہیں رکھ پائے۔ انہوں نے قریباً چار ماہ قبل یہ حویلی خریدی تھی، تب یہ تقریباً کھنڈر ہو چکی تھی۔ انہوں نے دن رات مزدوروں کو لگو کر اور چار پانچ ٹھیکے داروں کی نگرانی میں اس کھنڈر کو ایک بار پھر سے اس کی موجودہ چمکتی وکتی حالت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس مہمان خانے میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے، یہ نئی تعمیر تھی۔ اس سے پہلے یہاں انچر کے درختوں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا، جسے صاف کر دیا گیا تھا۔ لاکھوں روپے اس حویلی کی تزئین پر خرچ کرنے کے بعد جس روز انہوں نے اپنے پورے خاندان سمیت پہلا قدم اس دالان میں رکھا، بس وہیں سے ان کی مصیبتوں کی داستان شروع ہو گئی۔ حاجی رزاق کے خاندان میں ان کی بیگم کے علاوہ ان کی دولاڈلی صاحب زادیاں شامل تھیں۔۔۔۔۔ ۱۹ سالہ رباب اور ۱۷ سالہ نایاب۔ رباب بچپن ہی میں اپنے چچا زاد عا مر سے منسوب کر دی گئی تھی، جو اس وقت اپنی طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہاؤس جاب کے دوسرے سال میں تھا اور اگلے ساون سے پہلے ان کا رباب کی رخصتی کا منصوبہ تھا۔ حاجی رزاق کے بقول، جس وقت وہ اس حویلی میں داخل ہوئے تھے، وہ عصر کا وقت تھا اور شام کی چائے انہوں نے نوکروں سے کہہ کر باہر دالان ہی میں لگوائی تھی، کیوں کہ اندر کمروں میں ابھی جھاڑ پونچھ جاری تھی۔ لڑکیاں حویلی کے دالان میں چہل قدمی کرتی رہیں اور اسی اثناء میں مغرب کا وقت بھی ہو گیا۔ انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ چھوٹی نایاب تو ماں کے ساتھ اندر کی آرائش دیکھنے کے لیے جا چکی ہے اور وہ خود آخری سامان لانے والے ٹرک کے ڈرائیور اور نشی کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں مصروف رہے مگر۔۔۔۔۔ جب فراغت کے بعد پلٹ کر اندر جانے لگے تو نظر بڑی بیڑی رباب پر پڑی، جو کچھ عجیب سے انداز میں دالان میں کھڑی ہو کر پینیل کے پیڑ کو دیکھ رہی تھی۔ باپ نے آواز دی تو وہ چونک کر پٹلی اور کھوئے کھوئے انداز میں اندر کی جانب بڑھ گئی، لیکن اس کے بعد سے آج تک کسی نے اس لڑکی کو اپنے آپے میں نہیں دیکھا۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی اور اب تو وہ باقاعدہ راتوں کو اٹھ کر اس درخت کے پاس آ جاتی ہے اور باقاعدہ اس سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ مستقل بخار کی کیفیت نے اسے اس قدر چڑچڑا کر دیا ہے کہ اب تو اس



نے اپنے منگیتز عامر سے بھی بات چیت بالکل بند کر دی ہے۔ حالانکہ ایک وہ وقت بھی تھا جب وہ پہروں بیٹھ کر عامر کا شام کی چائے پر انتظار کیا کرتی تھی۔ حاجی رزاق بیٹیوں کی ایک خاص حد تک آزادی کے قائل تھے اور عامر تو ان کے اپنے بھائی کا بیٹا تھا۔ وہ خود بھی چاہتے تھے کہ رخصتی سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہو جائیں۔ لیکن اب تو رباب عامر کا نام سن کر ہی غصے سے کانپنے لگتی تھی۔ اگر عامر، رباب سے شدید محبت نہ کرتا ہوتا تو یہ رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ وہ خود بھی رباب کی اس حالت سے بے حد پریشان تھا اور میڈیکل کی اصطلاح میں جو کچھ بھی علاج ممکن تھا، اپنے سینئر ڈاکٹروں کے مشورے سے آزما چکا تھا، لیکن سب بے سود ہی رہا۔ رباب کی حالت روز بروز گزرتی ہی گئی۔ حاجی صاحب کی بیگم دبے لفظوں میں کئی بار ان سے کہہ چکی تھیں کہ انہیں یہ کوئی آسیب وغیرہ کا چکر لگتا ہے، لیکن عامر کو ان تو ہمت سے شدید چڑھتی۔ پھر بھی رباب کی ماں نے سب سے چھپ کر ایک بہت ”پچھنی ہوئی“ پیرنی کو اپنی کراماتی دھونی دینے کے لیے حویلی میں بلا بھیجا۔ لیکن جیسے ہی اسے چند لمبے کے لیے خود اسی کے کہنے پر رباب کے ساتھ اکیلے کمرے میں چھوڑا گیا تو کچھ ہی دیر بعد وہ چھتھی چلاتی ہوئی بدحواسی سے کچھ ایسی تیزی سے وہاں سے بھاگی کہ اپنی پیری فقیری کے سارے کراماتی لوازمات بھی اٹھانا بھول گئی۔

عامر کو شام کو جب اس بات کا پتا چلا کہ اس کی چچی نے رباب کا ”آسیب“ اتارنے کے لیے کسی عورت کو بلوایا تھا تو وہ بے حد ناراض ہوا اور اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب اگر کسی نے بھی ایسے کسی تجربے کو دہرانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ عامر غصے کا بے حد تیز تھا اور حاجی رزاق تو دونوں طرف سے پس رہے تھے۔ ایک طرف بیٹی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی تو دوسری طرف داماد رخصتی سے پہلے ہی پھسلا جا رہا تھا۔ لیکن جب میڈیکل نے پوری طرح جواب دے دیا تو انہوں نے بیٹی کی زندگی کے لیے داماد کی ناراضی کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لی لیا اور مولوی خضر کے ہاتھ پیغام بھیج کر سلطان بابا کو اپنے ہاں بلوایا، البتہ عامر اس بات سے ابھی تک بے خبر تھا۔ ابھی حاجی رزاق کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اچانک بوندا باندی نے تیز بارش کا روپ دھار لیا اور ہم جس شیشے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، اس کی دیواروں سے ٹکرا کر بارش کے موتی ایک عجیب سا جل ترنگ بجانے لگے۔ یہ بارشیں چاہے دنیا کے کسی خطے کی بھی ہوں..... ہوتی بالکل ایک جیسی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے مہوت کر دینے والی..... دلوں کے رنگ دھودینے والی..... ابھی ہم شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر فنا ہونے والی بوندوں کی سرگرم سن ہی رہے تھے کہ اندر سے کالے لباس اور کالی چادر میں ملیبوس ایک حسین لڑکی ہاتھ میں پانی کا فوارہ اٹھائے نکلی اور اس برستی بارش میں بھی پتیل کے پیز کو پانی دینے لگی۔ اسے اپنے بھگنے کا کوئی ہوش نہیں تھا اور اس کے چہرے کی پیلاہٹ اور زردی، میں یہاں اتنی دور بیٹھے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔ حاجی رزاق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اس کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہی میری بیٹی رباب ہے..... اس کی ابتر حالت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔“ دفعہ رباب کی نظر اٹھی اور اس نے شدید غصے اور بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں کی طرح ایک سیدھ میں شیشے کی اس دیوار سے پرے بیٹھے ہم لوگوں پر گر گئی، حالانکہ پیز اور اس برآمدے کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ بارش میں ہمارے بیوے تک باہر سے گزرتے کسی شخص کو واضح نظر نہیں آ سکتے تھے، لیکن رباب نے سینکڑوں گز دور سے ہمارے جانب یوں دیکھا جیسے ہم اس کے بالکل سامنے ہی بیٹھے ہوں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے فوارے کو زور سے ایک جانب پٹا اور غصے میں پھنکارتی ہوئی، تیز بارش کی لپٹوں ہی الجھتی ہوئی ہماری جانب بڑھی۔ طوفانی ہوانے اس کے سر سے چادر ڈھلکا دی اور جس وقت اس نے شیشے کے دروازے کو توڑ دینے

والے انداز میں دھکا دیا، تب تک اس کا کانچ سے بنا کول وجود ایسے دھل چکا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی موتی سمندر کی تہہ سے باہر نکالا گیا ہو۔ اس کا بھیگا گلابی حسن غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ گھنی لٹیں بھیگ کر چہرے سے یوں لپٹی جا رہی تھیں، جیسے بے نقاب فتنے پر حجاب کا پردہ ڈالنا چاہتی ہوں۔ رباب کچھ دیر تک دروازے میں کھڑی غصے سے ہم سب کی جانب دیکھتی رہی اور پھر اس کی نظریں سلطان بابا پر تنگ گئیں جیسے اسے ان کا وجود سخت ناگوار گزرا ہو۔ رزاق صاحب بالکل ہی بوکھلا سے گئے۔ ”آؤ بیٹا آؤ۔۔۔۔۔ یہ سلطان بابا ہیں۔۔۔۔۔ بہت دور سے تم سے ملنے آئے ہیں اور یہ۔۔۔۔۔“ رباب نے باپ کی پوری بات سننے بغیر ہی درمیان میں کاٹ دی۔ ”کیوں آئے ہو یہاں۔۔۔۔۔؟“ وہ براہ راست سلطان بابا سے مخاطب تھی۔ اب تک اس نے اپنے باپ، یا میری جانب دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ حاجی رزاق نے اسے ڈانٹا۔ ”رباب۔۔۔۔۔ یہ کون سا طریقہ ہے مہمانوں سے بات کرنے کا۔۔۔۔۔؟“ رباب نے پلٹ کر ایک نگاہ غلط پہلے حاجی رزاق اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر سلطان بابا کو اسی طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتی ہوئی پلٹ کر وہاں سے چل دی۔ حاجی رزاق نے بے بسی سے ہماری جانب دیکھا۔ ”معافی چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن میں خود بھی بے بس ہوں۔“ سلطان بابا نے، جو رباب کو دیکھنے کے بعد کسی گہری سوچ میں گم ہو چکے تھے، حاجی رزاق کو تسلی دی کہ اللہ بہتر کرے گا۔

بارش کا زور تو کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، لہذا سلطان بابا کی فرمائش پر حاجی رزاق نے چند پھتریوں کی پناہ تلے ہی ہمیں پوری حویلی کا دورہ کروایا۔ سلطان بابا نے بطور خاص حاجی رزاق سے دریافت کیا کہ اس مکان کی بیرونی چار دیواری کے حساب سے حویلی کو کھل کتنے کونوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟ گھر کی اندرونی ساخت کے مطابق حویلی کے کل سات کونے بنتے تھے۔ سلطان بابا نے اسی وقت قریب کھڑے نوکروں میں سے ایک کو باز بھیج کر پانچ پانچ لمبی لوہے کی سات کیلیں لانے کا کہا۔ سب اپنی دھن میں مگن تھے، لیکن نہ جانے مجھے کیوں مسلسل ایک عجیب سی بے چینی اور الجھن کا احساس ہو رہا تھا، جیسے کوئی اس سارے عمل کی نگرانی کر رہا ہو اور پھر جب ہم حویلی کے پچھلے حصے میں باغ کی جانب والے کونوں میں سلطان بابا کی پڑھی ہوئی کیلیں ایک ایک کونے میں گاڑ رہے تھے تو اچانک ہی میری نظر رہائشی کمروں کی ان کھڑکیوں کی جانب اٹھ گئی، جو یہاں پچھلے باغ کی جانب کھلتی تھیں، تب میں نے ان میں سے ایک کھڑکی میں رباب کو اپنی آنکھوں میں خون لیے گھورتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت وہ غصے میں چوٹ کھائی ہوئی کسی ناگن کی طرح مل کھا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہماری نظریں ٹکرائیں تو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سردی لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ نظر کچھ اور ہی تھی۔۔۔۔۔ اپنے اندر ایک پیغام۔۔۔۔۔ ایک دھمکی لیے ہوئے۔۔۔۔۔ ایک جانی دشمن کی نظر۔۔۔۔۔ ابھی میں اس ماہ رخ کی نظر کے پیچ ہی میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک گیٹ کی جانب سے کسی کار کی اسکرینج کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی ایک وجہرہ نوجوان غصے میں دندناتا ہوا ہماری جانب بڑھا چلا آیا۔ میں اس کے پہلے جملے ہی سے سمجھ گیا کہ وہ رباب کا منگیترا عامر ہے۔ اس نے چھوٹے ہی کہا ”رزاق چچا۔۔۔۔۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔۔۔۔۔ آپ نے پھر کسی ڈھونگی کو رباب کے علاج کے لیے بلوایا ہے۔۔۔۔۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود۔“ حاجی رزاق گڑبڑا سے گئے۔ ”آؤ عامر بیٹا۔۔۔۔۔ ان سے ملو۔۔۔۔۔ یہ سلطان بابا ہیں۔۔۔۔۔ میں نے انہیں۔۔۔۔۔“ عامر غصے سے دھاڑا ”آئی ڈیم کثیر کہ یہ کون سے بابا ہیں۔۔۔۔۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“ حاجی رزاق کی صورت حال کچھ عجیب سے ہو گئی۔ ان کے داماد نے آتے ہی ان کے مہمانوں کو ڈھونگی قرار دے دیا تھا۔ ایسے میں سلطان بابا نے حاجی صاحب کی مشکل آسان کی اور بولے۔ ”کسی کے سچ، یا ڈھونگ کا فیصلہ کرنے کے لیے تم نے



بہت کم وقت لیا نو جوان..... ہمیں حاجی صاحب نے نہیں بلایا..... ہم دو دن کے مسافر ہیں..... خود ہی آئے ہیں، کچھ دیر سستا کر آگے بڑھ جائیں گے..... ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“ عامر براہ راست سلطان بابا کی بات سن کر کچھ غصے میں پڑ گیا، لیکن تب تک حاجی رزاق سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے ذرا سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”تم سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی عامر میاں..... کچھ بھی ہو، مگر میں کسی کو بھی اپنے گھر میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے نہیں دوں گا۔“ عامر غصے سے پلٹا اور زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وہ پورا دن سلطان بابا نے حویلی کے محل وقوع اور اندرونی جائزے میں گزار دیا۔ شام کی چائے پر حاجی رزاق کی بیگم اور ان کی چھوٹی بیٹی نایاب سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں بیٹیاں شاید ماں ہی کا ٹکس تھیں۔ نایاب بھی اپنی بہن کی طرح لاکھوں میں ایک تھی، لیکن اس وقت بہن کی پریشانی کی وجہ سے خود بھی کمزور سی تھی، البتہ رباب سے ہمارا دوبارہ سامنا نہیں ہوا۔ رات کو تہائی میسر ہوئی تو میں نے سلطان بابا سے استفسار کیا۔ انہوں نے ایک گہری سی سانس لی۔ ”بڑی آزمائش پڑنے والی ہے ساحر میاں..... دعا کرنا کہ خدا ہمیں ثابت قدم رکھے۔“ میں نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”کبھی آزمائش..... اس لڑکی کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے.....؟“ سلطان بابا نے اپنی تسبیح گھماتے ہوئے جواب دیا۔ ”شاید تمہیں مولوی خضر نے بتایا ہو کہ بظاہر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود، اس دنیا کے علاوہ بھی اور بھی بہت سی دنیاں موجود ہیں..... لیکن ہم اپنی آنکھوں اور اپنے ذہن اور عقل کو عطا کی جانے والی محدود بصارت کی وجہ سے اس متوازی اور بالکل ہماری دنیا کے ساتھ جیتی جاگتی اس دنیا کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بس، یوں سمجھ لو کہ یہ بھی ایک ایسی ہی متوازی دنیا کے کسی مکین کا ہماری دنیا میں دخل دینے کا معاملہ ہے..... اور یاد رہے کہ اس پوری کائنات کا نظام، اس بنیاد اور اصول پر قائم ہے کہ ہر ذی روح اپنے مقرر کردہ دائرے میں سفر کرے اور دوسری دنیا کے محور میں دخل اندازی نہ کرے۔ اسی اصول کی بنیاد پر یہ لاکھوں کہکشاں، چاند، ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں اور اس گردش کی ذرا سی بھی غیر قدرتی تبدیلی، یا تغیر کو قیامت سے تشبیہ دی جاتی ہے، کیونکہ اس اصول سے بال برابر انحراف بھی اس قدر تباہی و بربادی کا باعث بن سکتا ہے جو کسی قیامت سے کم نہیں ہوگا۔“ مجھے پوری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ”میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھا..... یہاں اس گھر میں کون سی دوسری دنیا کے مکین مداخلت کر رہے ہیں.....؟“ سلطان بابا نے تسبیح ختم کر کے خود پر اور مجھ پر پھونکا۔ ”جنات..... اس حویلی پر واقعی کسی آسیب کا سایہ ہے۔“ میری حیرت سے وہ سمجھ گئے کہ میں اس ترقی یافتہ دور کی بھائی دوڑتی سیٹلائٹ اتج میں اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پا رہا ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”جنات پر یقین تو رکھتے ہونا..... قرآن میں باقاعدہ ان کا کئی جگہ ذکر موجود ہے..... اور ان کا مسکن بھی یہی ہماری دنیا ہے..... بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہم سے مخفی ہیں اور ان کا دائرہ حیات اور معاشرہ ہمارے محور کے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ہم سے یک سرچہ جدا ہے اور عام حالات میں وہ کبھی ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ البتہ مجھے اس بات پر شدید حیرت ہے کہ اس گھر پر آسیب کا بھاری سایہ ہونے کے باوجود مجھے ابھی تک یہاں کسی شرکا شباب تک نہیں ہوا، کیونکہ معاملہ اگر بدی، یا شرارت کا ہوتا تو اب تک وہ مخلوق آسمان سر پر اٹھا چکی ہوتی، جی کہ اس نے اس وقت بھی کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کی، جب میں نے اس کی امکانی بندش کا بندوبست کرنے کا سامان کیا تھا۔ عام حالات میں وہ ایسے موقع پر پلٹ کر جوابی وار ضرور کرتی ہے۔ آگ کے خمیر سے انھی اس مخلوق کا برتاؤ بھی کسی ناری طرح ہی بھڑکیلا، گرم اور جلا دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن خلاف توقع اس بار اس کا رویہ بالکل

مختلف ہے اور دھیان رہے، اس بار تمہاری تربیت کا یہ سب سے نازک اور مشکل مرحلہ ہے۔ ہر گز رتا دن تمہیں اس متوازی دنیا کی مزید جیتیں بتا کر جائے گا۔ شرط صرف خود کو سنبھالے رکھنے کی ہے۔ اب تک ہم جس متوازی دنیا کے اسراروں کا صرف تذکرہ ہی کرتے آئے ہیں، ان میں سے ایک متوازی دنیا اپنی مخلوق سمیت خود اس گھر میں موجود ہے.....“ جانے سلطان بابا کی اس تنبیہ میں ایسا کیا تھا کہ مجھے خود اپنے رو نگئے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رات دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اب مجھے سمجھ آنے لگا تھا سکندر اور نائلہ سے ملاقات بھی دراصل میری تربیت ہی کا ایک حصہ تھی، لیکن کیسے؟ دفعۃً میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے۔ مولوی خضر نے بہت تفصیل کے ساتھ مجھے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھایا تھا کہ ہم خواہ مخواہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ موت تو خود زندگی کی تب تک حفاظت کرتی ہے، جب تک اس کے نزول کا وقت نہیں آ جاتا اور موت زندگی کو خود وہاں سمجھ لاتی ہے، جہاں پر انسان کی آخری سانس لکھی ہوتی ہے۔ مجھے مولوی خضر کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کا سنایا ہوا قصہ بھی یاد آیا کہ کیسے جنات خود مرنے والے کی فرمائش پر اسے ہزاروں میل دور وہاں چھوڑ آئے تھے، جہاں وہ اپنی دانست میں موت سے بھاگ کر جانا چاہتا تھا، لیکن ملک الموت کو اسی مقام پر اس کی سانسیں ضبط کرنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک اور بجلی کوندی، تو گو یا رحیم پور کی سینٹرل جیل کے اس پچاسی گھاٹ پر کسی اور کی قضا طے تھی، جس کے لیے قدرت نے سکندر کا اتنا لمبا اسکرپٹ لکھ ڈالا تھا۔ سکندر کی سانسیں تو کب کی گئی جا چکی تھیں۔ اس کی موت تو بڑی واضح اور طے شدہ تھی، لیکن نائلہ جو اس پچاسی گھاٹ سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی دیس میں بیٹھی ہوئی تھی، اگر وہ واپس اپنے ملک کی غلاٹ لے کر وہاں نہ پہنچتی اور وقت پر پہلے رحیم پور اور پھر جیل تک نہ پہنچ پاتی تو بظاہر اس کی موت کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نائلہ کی غلاٹ کیوں مس نہیں ہوئی۔ فرین لیٹ کیوں نہیں ہوئی اور وہ اس برستے طوفان سے چند لمحے پہلے رحیم پور تک کیسے آن پہنچی تھی، جب کہ اس کے آنے کے چند لمحے بعد ہی رحیم پور کا واحد پل بھی برساتی ریلے میں بہہ گیا تھا۔ وہ پل نائلہ کی ٹیکسی گزرنے سے پہلے کیوں نہیں بہا؟ گویا سب کچھ پہلے ہی سے طے شدہ تھا۔ نائلہ کو اپنے شوہر کے قاتل کی پچاسی دیکھنے کے بہانے اس پچاسی گھاٹ تک پہنچنا ہی تھا، جہاں اس کی آخری سانس لکھی ہوئی تھی اور پروالے کا اسکرپٹ تو دیکھنے کس غضب کا تھا، دنیا کو مرنے والی کی موت کا بہانہ بھی فراہم کرنا تھا قدرت کو۔ لہذا اس بہانے کا بھی پورا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ سکندر کے ہاتھوں خود اسی کی محبت کے شوہر کو قتل کروا کر اس کی پچاسی کا بندوبست کیا گیا اور پھر انتقام کی آگ میں جلتی نائلہ کو قاتل کے سامنے لا کھڑا کیا، تاکہ پہلے تو وہ اسے پہچان کر معاف کر دے اور پھر خود بھی اس کی موت کے جھمکے کے ساتھ ہی اپنی سانسیں بھی جاں آفریں کے سپرد کر دے۔ اب پتا نہیں رہا اب کی اس حویلی میں مجھ پر کون سا مجید اور اسرار کھلنے والا تھا۔ اس متوازی دنیا کی وہ کون سی پرت تھی، جس کا میرے اس کمزور وجود پر انکشاف ہونا تھا۔ میں تو سکندر اور نائلہ کے اس پہلے تجربے ہی سے روح کے آخری ریشے تک ٹھہرا ہوا تھا۔ اچانک ہی مجھے لاعلمی کے سکون پر رشک اور آگہی کے عذاب سے شدید خوف محسوس ہونے لگا۔ مجھے عام لوگوں کی زندگی ایک نعمت لگنے لگی، لیکن آگہی کا یہ راستہ اور دوسری دنیاؤں کے اسرار و رموز کا یہ راستہ بھی تو میں نے خود ہی چنا تھا۔ کیا اس طرح بچ راہ میں حوصلہ ہار دینا ٹھیک ہوگا؟ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک کھٹکے نے چونکا دیا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا اور بارش نہ جانے کس وقت تھم چکی تھی۔ پہلے تو میں اسے واہمہ ہی سمجھا، لیکن پھر دوبارہ وہی سی ہی آواز پیدا ہوئی، شاید باہر



دالان میں کوئی تھا۔ میرے اور سلطان بابا کے کمرے علیحدہ علیحدہ تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ انہیں بھی جگا دوں، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ پچھلی کئی راتوں سے انہوں نے مکمل آرام نہیں کیا، تنہا ہی باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی میں نے انکیسی کے شیشے سے بند برآمدے کا دروازہ کھولا تو تیز اور سرد ہوا کے ہچکے جھونکے نے پورے وجود کو جھرجھراسا دیا اور تبھی وہ گھٹنگھر ووں کی جھنکار جیسی تیز سرگوشی پہلی مرتبہ واضح طور پر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کان کے بہت قریب اور دھیرے سے کہا ”یا قوط“ ہاں..... یہی لفظ تھا۔ سرگوشی کالب و لہجہ عربی اور انتہائی نستعلیق نہ ہوتا تو شاید میں بھی اردو والے یا قوت اور اس لفظ یا قوط میں فرق نہ کر پاتا۔ لیکن آخری حرف ”ط“ کی گردان اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا، لیکن وہاں دور دور تک میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ البتہ سرگوشی اتنے قریب سے کی گئی تھی کہ مجھے ابھی تک اپنے کان کی لو کسی کی گرم سانس کی حدت سے تعلق ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ابھی اس لمحے کا شکار تھا کہ دفعۃً میری نظر دور دالان میں چلتے ہوئے کسی سائے پر پڑی ارے..... یہ تو باب تھی۔ لیکن اندھیری رات اور سنائے میں وہ اس وقت گنگے سر، ہال کھولے کیا کر رہی تھی؟ وہ اس وقت بھی اسی کالے جوڑے میں ملبوس تھی اور اس کا مہتاب چہرہ اس وقت بھی کسی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میں برآمدے کے سامنے راہ داری کے ستون کی اوٹ لے کر اسے دیکھتا رہا۔ باب کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی پینیل کے پیڑ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی بیولے کی غیر واضح حرکتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ وہاں کسی سے مخو گنگتو تھی۔ میں ستون کی اوٹ سے نکل کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درخت کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ مجھے یہاں سے دھند اور کھر میں پلٹی رہا باب کا چہرہ تو واضح نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن اس کی آواز بالکل واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے مخاطب تھی۔ ”نہیں..... بہت انتظار کر لیا میں نے..... اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم تو مجھے دیکھ سکو..... جب بھی تمہارا دل چاہے، مجھے اپنی نظر سے نہا سکو..... لیکن میرا سن تمہیں دیکھنے کے لیے یونہی ترسار ہے، تڑپتا رہے..... میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں یا قوط..... میں بھی تمہاری ایک جھلک پانے کے لیے ترس رہی ہوں..... پل پل مر رہی ہو..... میرے صبر کو اور مت آزمائو..... ورنہ اب میں واقعی تم سے روٹھ جاؤں گی.....“ یہ رہا باب کس سے باتیں کر رہی تھی؟ جواب میں کسی نے کچھ کہا، یا نہیں، یہ میں سن نہیں پایا، کیوں کہ اچانک ہی مخالف سمت کی بہت تیز ہوا چل پڑی تھی اور جب ہوا کی لہر رکی تو میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کچھ سننے کی کوشش کی، لیکن اب پھر باب بول رہی تھی۔ ”نہیں..... اور کتنا چھپو گے مجھ سے..... بس، اب اور نہیں سہا جاتا مجھ سے یہ آنکھ جھوٹی کا کھیل..... دیکھو..... کیا حالت ہو گئی ہے میری..... میں اتنی سخت جاں نہیں ہوں یا قوط..... میں مر جاؤں گی..... رحم کرو مجھ پر.....“ رہا باب کی حالت بالکل بھکاریوں جیسی ہو رہی تھی۔ آخر یہ کون سی ہستی تھی، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہ پری زادیوں گڑ گڑا رہی تھی۔ اب تو میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چلا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ایک جھٹکے سے درخت کی آڑ سے نکل کر باب کے سامنے آ گیا۔ وہ جھٹکے سے گھبرا کر پلٹی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کی تمام ملامت اور نرمی ایک پل میں غائب ہو گئی۔ وہ بری طرح چلا کر بولی۔ ”تم.....؟“



## آسیبِ محبت

اس ماہِ رخ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا، لیکن میری ساری توجہ اس ہستی کی جانب تھی، جس کی طرف دیکھ کر باب بات کر رہی تھی۔ لیکن یہ کیا، سامنے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف پیپل کا پیڑ اسی شان سے کھڑا تھا، جس کی اوٹ میں چھپ کر میں نے باب کی ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ پھر زور سے چلائی۔ ”میں پوچھتی ہوں کس کی اجازت سے تم یہاں آئے ہو..... چلے جاؤ یہاں سے..... نکل جاؤ میرے گھر سے..... نکل جاؤ۔“ باب کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اتنے میں اندر سے اس کے ماں باپ، بہن اور کچھ نوکر دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ دوسری جانب مہمان خانے سے سلطان بابا بھی شور سن کر باہر نکل آئے۔ باب تب تک بالکل ہی نڈھال ہو کر زمین پر گر چکی تھی۔ اسے فوراً اندر منتقل کر دیا گیا۔ سلطان بابا نے حاجی صاحب کے اصرار کے باوجود انہیں واپس حویلی بھیج دیا کہ وہ جا کر اپنی بیٹی کی خبر گیری کریں۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں کھڑے کھڑے ساری بات بتا دی۔ وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم اس پیڑ کی جانب دیکھتے رہے، پھر اچانک بلند آواز سے بولے۔ ”میں جانتا ہوں تمہارا بئیرا نہیں ہے..... اس سے پہلے کہ میں کوئی حتمی قدم اٹھاؤں میں آخری بار تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اس لڑکی کو اپنے اثر سے آزاد کر دو..... اگر ان لوگوں سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے، یا انجانے میں ان سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو انہیں معاف کر دو..... میں تمہیں تمہارا بئیرا چھوڑنے کو نہیں کہتا، تم چاہو تو خود اکیلے، یا پھر اگر دوسرے ساتھی بھی تمہارے ساتھ ہیں تو ان سمیت ہمیشہ یہیں رہ سکتے ہو، لیکن شرط صرف یہی ہے کہ اب تم ان بھلے لوگوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاؤ نہیں کرو گے..... میں تمہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں..... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے.....“ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے پلٹے اور مہمان خانے کی جانب چل پڑے۔ میں وہیں حیرت کے سمندر میں لنگ کھڑا، اس بے جان درخت کو دیکھتا رہا کہ وہ اتنی دیر تک کس نادیدہ ہستی سے باتیں کرتے رہے۔ یہاں تو دور دور تک کسی ذی روح کا سایہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب میں واپس کمرے میں پہنچا تو وہ کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ اچانک مجھے کمرے میں ایک مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ شاید ایک سینکڑ کے ہزاروں حصے میں مجھے یاد آیا کہ ٹھیک یہی خوشبو مجھے تب بھی محسوس ہوئی تھی جب سلطان بابا کے ہمراہ پہلی مرتبہ اس حویلی میں قدم رکھا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے ہنسی سے لگا ہوں سے میری جانب دیکھا۔ ”لڑکے..... اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو، بعض مرتبہ ہلکی سی چوک کا بھی بہت بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہاں! یہ وہی خوشبو ہے اور تم نے شاید غور نہیں کیا کہ یہ خوشبو اس وقت پیپل کے اس پیڑ سے بھی ابھر رہی تھی، جب لڑکی وہاں موجود تھی اور جب میں اس سے باتیں کر رہا تھا، لیکن تمہارے حواس کو منظر نے منتشر کئے رکھا۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو، وہاں سارا کھیل ہی حیات کا ہے۔ حیات پر عبور حاصل کرو گے تب ہی وجدان تک پہنچو گے.....“ میری تربیت کے دوران یہ پہلی سرزنش تھی جو سلطان بابا نے مجھے کی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اتنے بہت سے لوگوں نے مجھ سے اتنی بڑی بڑی توقعات کیوں وابستہ کر لی تھیں؟ میں تو ایک بہت معمولی سا انسان تھا، جس کا چند ہفتے پہلے تک



مذہب سے دور دور تک کوئی واسطہ، رابطہ ہی نہ تھا اور پھر ماضی کی کیا بات کروں میں تو حال کے ان دنوں میں بھی اکثر کھانے سے پہلے ”بسم اللہ“ تک کہنا بھول جاتا تھا۔ اگر سلطان بابا میرے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتے اور وہ زور سے بسم اللہ نہ پڑھتے تو مجھ سے ایسی روزمرہ کی نیکی بھی چھوٹ جاتی تھی۔ تو پھر جب میرے نسیان کی یہ حالت تھی تو ایسے میں عبداللہ، مولوی خضر اور سلطان بابا جیسی بڑی ہستیاں مجھ سے کسی غیر معمولی برتاؤ کی امید کیوں لگائے بیٹھے تھے؟ میں اپنی سوچوں میں گم، بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کہتے ہیں نیند سب سے بڑی چور ہوتی ہے۔ وہ انسان کی آدمی عمر چرا لیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ مجھ سے یہ چورنی بھی روٹھی ہوئی تھی۔ میں یونہی کروٹیں بدلتا رہا اور نہ جانے کس وقت سلطان بابا نے فجر کی نماز کے لیے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ سلطان بابا نے اس نادیدہ ہستی کو جس وقت بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی، اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے تین بجنے کو تھے، مطلب یہ کہ آج سہ پہر تک وہ مہلت ختم ہو جانی تھی لیکن تیزی سے ڈھلنے کے باوجود ابھی تک کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ باب ایک آدھ بار دالان کی طرف آئی، لیکن اس نے ہماری جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بالآخر عصر کی نماز بھی ہو گئی۔ سلطان بابا نے سلام پھیر کر میری جانب دیکھا۔ ”کیوں میاں..... کیا اب بھی وہ خوشبو محسوس ہو رہی ہے؟“ میں نے حیرت سے ان کے انداز کو ٹھٹھا۔ آخر انہیں مجھ سے تصدیق کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ خوشبو تو اس طرح چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو جائے نماز اٹھاتے ہوئے بولے ”چلو تصدیق ہو گئی۔ یاد رکھو..... مشورہ کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ حواس خمسہ بھی کبھی کبھار دھوکا دے جاتے ہیں۔“ مطلب یہ کہ یہ خاص خوشبو، جو ہمیں محسوس ہو رہی تھی، اس کا تعلق اس نادیدہ ہستی کی موجودگی سے تھا۔ گویا اس ہستی نے سلطان بابا کی مہلت کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سلطان بابا نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں کسی خاص دعا میں مشغول رہیں گے اور میں ان کے دروازے کے باہر بیٹھ جاؤں، تب تک کسی کو اس کمرے کے اندر نہ آنے دوں، جب تک وہ خود باہر نہ آ جائیں۔ انہوں نے مجھے سختی سے تلقین کی کہ میں نماز بھی وہیں برآمدے ہی میں کمرے کے باہر ادا کروں اور کسی کو بھی انہیں پریشان کرنے سے روکوں۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق دروازے ہی پر پڑیا ڈال لیا اور پھر اس دوران پہلے مغرب اور پھر عشاء کی نماز کا وقت بھی ہو کر گزر گیا اور پھر رات ڈھلنے لگی۔ میں گزشتہ رات بھی سو پایا تھا، اگرچہ یہ جگہ رات اب میرے لیے معمول کی بات تھی لیکن نہ جانے وہ اندھیری رات میری پلکوں پر اس قدر بھاری کیوں ثابت ہو رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب تو مجھے ایسا لگنے لگا کہ اگر میں نے مزید اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی تو میری روح آنکھوں کی پتلیوں سے ہو کر باہر نکل جائے گی۔ جانے کتنی بار میرا سر ڈھلکا اور کتنی بار میں اپنی جھونک میں لڑکھڑا کر پھر سے سنبھل کر میٹھا۔ ایسی ہی جان لیوا غنودگی کا جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ اچانک کسی نے شیشے والے برآمدے کا دروازہ کچھ اس زور سے دھڑ دھڑایا کہ کمزوری چٹختی علیحدہ ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی اور دروازے کے دونوں پٹ ایک دھماکے سے جا کھلے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے پتوں بچ وہی حسن بے حجاب اپنی آنکھوں میں خون اتارے کھڑا مجھے غور رہا تھا۔ باب کا آنکھل ڈھلکا ہوا تھا اور بال کھلے ہوئے۔ ہم دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے، پھر اس کی سرسراہٹ ہی آواز ابھری۔ ”وہ کہاں ہیں.....؟“ غالباً اس کا اشارہ سلطان بابا کی جانب تھا۔ میں نے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ ”وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔ مجھے یہی حکم ہے۔“ اس بار وہ باقاعدہ غرائی ”کیوں نہیں مل سکتے۔ بلایا ہے تو ملنا بھی پڑے گا۔“ اس نے قدم آگے بڑھائے اور میں باقاعدہ دروازے

کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنی راہ میں مزاحم کھڑا دیکھ کر اس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ”بٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ.....“ ابھی اس کی بات آدھی منہ میں تھی کہ اندر کا دروازہ کھل گیا اور مجھے اپنی پشت سے سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ”اسے اندر آنے دو عبداللہ میاں..... ہم اسی کا انتظار کر رہے تھے۔“ میں الجھن آمیز حیرت لیے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ متناقض ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ وہ سلطان بابا کے بالکل سامنے جا کر دوڑانوں ہو کر بیٹھ گئی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”آپ ہمیں کیوں تنگ کر رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا، جب کہ وہاں وہ فرد واحد تھی۔ سلطان بابا نے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ ”میں نے پہلے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ بارہ گھنٹے کی مہلت کے بعد مزید مہلت نہیں ملے گی۔ تم میرا سامنا کرنے سے کیوں کتراتے ہو۔ اس معصوم کا سہارا کیوں لے رہے ہو.....؟“

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان یہ کس قسم کی گفتگو جاری تھی۔ یہ سوال کس سے کئے جا رہے تھے اور جواب کون دے رہا تھا۔ رباب نے بے بسی سے سر پٹا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کمرے کے وسط میں بڑی چھوٹی سی تپائی کے نچلے حصے میں ایک قلم اور کاپی رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چیزیں اٹھالیں اور جلدی سے چند حرف گھسیٹ کر کاغذ چھڑا اور سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ بابا نے غالباً مجھے سنانے کے لیے بلند آواز میں تحریر پڑھی۔ ”میں آپ سے الجھنا نہیں چاہتا، نہ ہی میں رباب کے نازک اور کوئل وجود پر طاری ہو کر اور اسے اذیت دے کر آپ سے دو بدو بات کرنا چاہتا ہوں، آپ کو سلیمان علیہ السلام کا واسطہ..... آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔“ سلطان بابا نے کاغذ ایک جانب رکھا۔ ”میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو..... تم نے اب تک اسے، یا اس کے گھر والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہی تمہاری شرافت کی دلیل ہے..... لیکن تمہارا سحر بھی اس بنت آدم کے کوئل وجود پر بے حد گراں ہے۔ دیکھتے نہیں، کیا حالت ہو گئی ہے اس کی.....؟ اس کے حال پر رحم کرو..... بخش دو اسے.....“ رباب نے جھلاٹ میں جلدی سے مزید چند لائنیں صفحے پر گھسیٹیں اور پھر کاغذ سلطان بابا کو تھما دیا۔ لکھا تھا ”میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں..... آپ ہمارے درمیان نہ آئیں..... میں آپ سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا.....“ اس بار سلطان بابا کی آواز میں ایسی سختی تھی، جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ”یہ محبت نہیں سحر ہے..... تم ناری ہو اور یہ خاکی ہے..... اس کی روح پر قابض ہو کر اسے اپنے بس میں کرنے کو تم محبت کہتے ہو..... تمہیں تو اس کی زبان بولنے کے لیے بھی خود کو اس کے قلب پر طاری کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو، میں نے اب تک حتی الامکان سختی سے گریز کیا ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں آخری حد تک بڑھ جاؤں۔“ تحریری جواب آیا۔ ”میں آپ کی حد جانتا ہوں، اس لیے ملتتی ہوں کہ مجھے میری حد تک نہ دھکیلیں..... ناری اور خاکی کا سوال تو تب اٹھتا، جب بات جسم کے ملاپ کی ہوتی، یہ روح سے روح کے ملن کا مقدمہ ہے..... آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ بولی، یہ لفظ بھی میرے نہیں ہیں، لیکن لفظ تو بس رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی دنیا سے رابطے کے لیے یہ ذریعہ بھی اپنانا پڑا تو میں اپنالوں گا۔ آپ جو شرط بھی لگا لیں گے مجھے قبول ہوگی، بس مجھے یہاں سے بے دخل نہ کریں..... مجھے ہمیں ایک کونے میں پڑا رہنے دیں۔ میری ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی.....“ اس مرتبہ سلطان بابا باقاعدہ گرجے۔ ”بس..... بہت ہو گیا۔ یہ فطرت کے قانون کا معاملہ ہے۔ تمہیں اس لڑکی کی روح پر سے اپنا قبضہ اٹھانا ہوگا، ورنہ.....“ لیکن سلطان بابا کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رباب وہاں سے اٹھ کر واپس چل دی۔



میں نے سائنس کی اصطلاح میں ہپناٹزم کے بارے میں پڑھ ضرور رکھا تھا، لیکن اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو اس ہپناٹزم کے زیر اثر دیکھا تھا۔ اگر یہ سارا عمل میری آنکھوں کے سامنے نہ ہوا ہوتا تو میں ضرور اسے کسی ایسے ہی ٹرانس کا کرشمہ سمجھتا، لیکن سائنس کی اب تک کی حد انسانی ذہن کی مقرر کردہ ہے، جب کہ عبداللہ لقب پانے کے بعد جس متوازی دنیا کا میں مسافر بننے جا رہا تھا، اس کی سرحد ہی شاید وہاں سے شروع ہوتی تھی، جہاں آ کر سائنس کی حدیں دم توڑ دیتی تھیں۔ یہ کیسا عجیب واقعہ تھا، جو میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر تھا۔ آسیب کے قصے تو میں بھی بچپن ہی سے سنتا آیا تھا اور بچپن میں تو ہم باقاعدہ ایک دوسرے کو ”الٹے چروں والی چڑیلوں“ کے قصے سنا سنا کر ڈرایا بھی کرتے تھے۔ شاید رات اور اندھیرے کے خوف سے جو ایک براہ راست تعلق ہوتا ہے ایسے قصوں کو جنم دینے میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن یہاں تو آسیب، ایک گل رخ کی محبت میں نہ صرف خود گرفتار تھا، بلکہ اسے اس دل ربا کے محبوب ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔ کیا واقعی جن وانس کے درمیان ایسی کسی محبت کا گمان بھی پایا جاسکتا ہے؟ مجھے ایک مرتبہ پھر سے ”محبت“ نامی اس عفریت کی بے پناہ قوت کا اندازہ ہوا۔ یا قوط نامی یہ ناویدہ ہستی، جو عام حالات میں شاید اپنی ایک پھونک سے اس پوری حویلی کو ہنس نہس کر سکتی تھی، جو شر اور بگاڑ پیدا کرنے پر آ جاتی تو شاید اسے روکنا بھی ہم کمزور انسانوں کے بس میں نہ ہوتا، لیکن ایک نازک سی لڑکی نے اسے اس قدر مجبور و بے بس کر ڈالا تھا کہ وہ خود سوالی بن کر ہم انسانوں کے آگے ہاتھ باندھ کھڑی تھی۔ بظاہر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یا قوط نے سلطان بابا کی تنبیہ کا اثر نہیں لیا تھا۔ خود سلطان بابا کے ذہن میں بھی یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگی کہ زیادہ سختی لڑکی کے لیے کسی مصیبت کا باعث بھی بن سکتی ہے، کیوں کہ اس حویلی نے اب تک یا قوط کا ایک ہی رخ دیکھا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر بیک وقت صحرا اور ساون ہوتا ہے۔ البتہ ہمارے اندر کا ساون ہمارے ارد گرد موجود کسی ایک آدھ خوش نصیب کے اوپر ہی برستا ہے، باقی اپنے تو ساری عمر ہمارے اندر کے صحرا کی تپش ہی جھیلنے رہتے ہیں۔ یا قوط کے اندر کا ساون بھی صرف رباب کی حد تک ہی تھا اور ڈھلتی ہوئی وہ بھیگی رات مجھے ہر پل یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں اس کے صحرا کی پیاس ہمارے حلق میں کانٹے چھو جائے گی۔

فجر کی نماز پڑھتے ہی سلطان بابا نے چند پڑھی ہوئی میٹھیں اٹھائیں اور میرے ہاتھوں انہیں ٹھیک پینپل کی جڑوں کے قریب گاڑ دیا اور شاید ٹھیک اسی وقت رباب کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ سورج نکلنے تک اس کی وحشت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اسے قابو میں رکھنے کے لیے اس کی ماں اور بہن کو باقاعدہ جکڑنا پڑا تھا۔ شاید گھر کے کسی نوکر نے عام کو بھی خبر کر دی تھی اور صبح ساڑھے نو بجے کے قریب وہ اپنے سینئر ڈاکٹر اور نفسیات کے ایک پروفیسر کے ساتھ حویلی آ پہنچا۔ ہمیں اپنی منگلیتر کے پاس دیکھ کر اس کی تیوری چڑھ گئی۔ ”آپ لوگ ابھی تک یہیں ہیں۔ پلیز آپ لوگوں کو جو چاہئے۔ وہ لے کر یہاں سے چلتے بنئے۔ میں اپنے سینئر کونسلرز کو لے کر آیا ہوں۔ یہ سیدھا سادہ ہسپتال کا کیس ہے۔ آپ اس میں کچھ نہیں کر سکتے، لہذا دخل اندازی نہ کریں تو بہتر ہوگا۔“ رباب خشکیوں نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ نفسیات کے پروفیسر نے اپنی عینک درست کی۔ ”جی جی..... بالکل..... دراصل بچی کے لاشعور میں بچپن کا کوئی خوف دوبارہ گیا ہے، جو اس گھر میں آ کر پھر سے اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کے دل سے یہ ڈر نکالنا ہوگا۔“ سینئر ڈاکٹر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ہسپتال کی بہت سے اقسام ہوتی ہیں، لیکن ان سب کا علاج ممکن ہے۔ بس ہمیں مریض کے آرام..... لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رباب زور سے چلائی۔ ”چلے جاؤ..... نکل جاؤ تم سب یہاں

سے.....“ حاجی رزاق اور ان کی بیگم لاچار سے کھڑے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلطان بابا نے سکون سے ڈاکٹروں کی ساری بات سنی اور پھر دھیرے سے بولے۔ ”آپ کا مریض آپ کے سامنے ہے۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں، اس کی دوا کر سکتے ہیں۔ مجھے بس اس کے لیے دعا کرنے دیں..... کیا مجھے دعا کی اجازت بھی نہیں دیں گے آپ لوگ؟“ سلطان بابا کی بات نے وقتی طور پر انہیں لا جواب کر دیا اور ڈاکٹر صاحبان نے اپنے بکس کھولے اور انجکشن وغیرہ تیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سلطان بابا مجھے لیے کمرے سے باہر نکل آئے۔

میں بہت دیر اسی ہتھیل کے نیچے بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ سائنس اور روحانیت کا یہ جھگڑا آخر کب تک چلے گا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ دنیا میں سائنس پہلے وارد ہوئی تھی، یا روحانیت۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں علم اپنے اندر ہر سوال کے جواب کی وسعت رکھتے تھے۔ اگر میں نے رباب کو رات کو اس روپ میں نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی ان ڈاکٹر ز کی بات پر یقین کرنے میں کچھ تامل نہ ہوتا، لیکن سائنس تو صرف جسم کے زخموں کو مندل کرنا جانتی ہے..... اور اگر کسی کی روح گھائل ہو تو وہ کہاں جائے.....؟ ہماری زندگی میں دعا کی کیا اہمیت ہے؟ دعا کو عبادت کا مغز کیوں کہا گیا ہے؟ معجزہ کسے کہتے ہیں؟ معجزات اور دعاؤں کا آپس میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔ دفعۃً مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جس متوازی دنیا کے اسرار جاننے کے لیے میں گھر سے نکلا تھا، اس دنیا کے زخموں کی پہلی سائنس ہی ”دعا“ تھی اور اس دنیا کی بیماری اور روگ محرور جادو تھا۔ میرے ذہن میں ایک اور عجیب بات بھی آئی کہ جب سائنس نہیں تھی، تب ایسے روگوں کی دوا کیا ہوتی ہوگی؟ میرے خیالوں کا تسلسل اندر سے بلند ہوتی رباب کی جینوں نے توڑ دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا جانے کب کے مہمان خانے کی طرف جا چکے تھے۔ رباب کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے میں نے اسے ڈاکٹروں کے زرخے میں درو اور بے چینی سے تڑپتے ہوئے، زور لگا کر چھوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اور کرب سے چلاتے ہوئے دیکھا۔ سلطان بابا نے مجھے پہلے خبردار کر دیا تھا کہ انہوں نے ہتھیل کے پیڑ کے گرد یا قوط کے لیے آخری بندش لگا دی ہے اور اب اگلے چند گھنٹے نہایت سخت گزریں گے، کیوں کہ اب وہ نادیہ ہستی بے ٹھکانہ ہو چکی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں اب کھلی جنگ کا طبل بج چکا تھا اور سلطان بابا کی پیش قدمی کے بعد اب ہمیں یا قوط کی جوابی کارروائی کا منتظر رہنا چاہئے تھا۔ لیکن رباب اتنی بے چین کیوں تھی؟ کیا یہ کرب اور تکلیف واقعی ایک محبوب پر لگائی گئی پابندیوں کا نتیجہ تھا، یا پھر سینئر ڈاکٹر کے بقول، یہ اسی ہسٹریا اور خوف کی کیفیت تھی جو رباب کے لاشعور میں بہت پہلے سے کہیں چھپا بیٹھا تھا اور روپ بدل بدل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم اس نازک سی لڑکی کو بے قرار ساڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں کھڑکی سے باہر کافی فاصلے پر، لیکن بالکل سیدھ میں ہتھیل کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ جانے اس ایک نظر میں کیا کچھ تھا، بے بسی، لاچاری، غصہ، رحم کی فریاد، شکایت اور گلہ۔ مجھے یوں لگا کہ وہ نظر صرف نظر نہیں، کسی گھائل کی آخری آہ ہے۔ جو زہر میں بچھے ایک تیر کی طرح عین میرے دل کے وسط میں پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔ میں گھبرا کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا، لیکن اس کے بعد پورا دن ایک عجیب سی بے چینی میرے سارے رگ و پے میں دوڑتی رہی۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے اس بد نصیب کے لیے رحم کی اپیل کر دوں۔ آخر ہمیں کیا حق حاصل تھا، کسی کے خوابوں کی سلطنت کو یوں تخت و تاراج کرنے کا۔ اگر یا قوط نامی کوئی بیولا رباب کے خوابوں کا مرکز بن چکا تھا اور چاہے وہ صرف ایک پیمانہ ہی تھا اور رباب کے انتہائی طاقت ور تخیل نے اس خواب کو اس کے سامنے ایک حقیقت کے روپ میں لا کھڑا کیا تھا، تب بھی ہم کون ہوتے ہیں کسی کے خوابوں پر ڈاکا ڈالنے والے؟ اور پھر اس کا منگیتر اور باقی ڈاکٹر اپنی



سی کوشش تو کر رہی رہے تھے، کم از کم ہمیں اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایک بات کا شدت سے احساس کیوں ہوا کہ کبھی کبھی یہ دنیا یاروں کی وجہ سے اتنی بری جگہ نہیں بنتی، جتنا برا اسے ہم جیسے ”اچھے“ بنادیتے ہیں۔ رباب کی اس بے کل نظر کے بعد میں خود بھی سارا دن بہت بے چین سا پھرتا رہا۔ سلطان بابا اپنے وظیفے میں مشغول تھے، لہذا ان سے اپنی یہ بے کلی بانٹنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

شام کو پھر وہی ڈاکٹروں کی ٹیم آئی اور پھر سے وہی سارا سلسلہ دوبارہ دہرایا گیا۔ جب وہ لوگ حویلی کے پورچ سے نکل رہے تھے، تب میں وہیں دالان ہی میں موجود تھا۔ سینئر ڈاکٹر، عامر سے کچھ بات کر رہا تھا کہ ”آج کل ڈائی پلر تھیوری آف گرے (Dipolar Theory Gravitation) کا بہت چرچا ہے۔ عامر تم انٹرنیٹ پر ضرور اس صفحے کی تفصیلات پڑھنا۔ انسان کا لاشعور اس سے کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور بھی مغرب تو یہ بات ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ ہم بذات خود ایک واہمہ ہیں، ایک حقیقی دنیا کا سا تو اس عکس ہیں۔ ایسے میں اگر رباب کسی متوازی دنیا کے خواب کو حقیقت سمجھ بیٹھی ہے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ بس ایک ذرا سراسر مل جائے اس گتھی کا، ہم یہ کیس ضرور حل کر لیں گے۔ یوجسٹ ڈونٹ وری ڈیر، یہ صرف اور صرف خواب در خواب کی بیماری ہے۔ ہمیں سب سے پہلے رباب کو اس کے آخری خواب سے باہر لانا ہوگا۔ پھر آخر سے پہلا اور پھر دوسرا۔ دراصل وہ خواب میں بھی خواب دیکھ رہی ہے۔ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں..... لیکن یاد رہے..... بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سے ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی اور ہم نے رباب کے خواب در خواب کے تسلسل کو اسی طرح سے توڑا کہ ہم نے اس کے آخری خواب سے پہلے کے کسی خواب کو راستے میں چھینز دیا تو پھر ہمارے ہاتھوں سے اس بھول بھلیوں کا یہ راستہ ہمیشہ کے لیے کھوجا جائے گا اور رباب یونہی ساری عمر کے لیے بھٹکتی رہ جائے گی.....“ وہ سارے کافی دیر تک وہیں سر جوڑے رباب کی بیماری پر بحث کرتے رہے۔ تو گویا نفسیات کی اصطلاح میں رباب پیاز کی تہوں کی طرح تخیل کے جال میں پھنس گئی ہے اور اب اسے اس خوابوں کی دنیا سے نکالنے کے لیے پیاز کی آخری تہ سب سے پہلے کھولنی ہوگی اور پھر ترتیب وار اسے اس تخیل کے جال سے نکالنا ہوگا اور اس سارے عمل میں اگر کہیں غلطی سے بھی کوئی غلطی نہ کھل گئی تو رباب ہمیشہ کے لیے اپنے اسی خواب کی تہہ کی قیدی بن جائے گی۔

اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کہیں میں خود بھی تو کسی ایسے ہی خوابوں کے جالے میں پھنسا وقت کا شکار تو نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی تو ایسے ہی منظر دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی چند لمحوں کے بعد مستقبل کے جھماکے ہوتے رہتے ہیں، کہیں درگاہ میں داخلے کے وقت سے لے کر اب تک میں خود بھی کسی خواب در خواب سلسلے کا شکار تو نہیں ہوتا گیا تھا؟ یا خدا..... یہ کیسے بھید، کیسے راز تھے؟ میں اسی الجھن کے تانے بانے بنا اور ادھیڑ تار رہا۔ جانے کب رات ڈھلی اور کب حویلی میں سنائے نے اپنا راج پھیلا یا، مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ سلطان بابا تو ویسے بھی عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور جاتے وقت وہ خاص طور پر مجھے تاکید کر کے گئے تھے کہ انہوں نے یا قوت کے غیر مرئی وجود کے لیے پوری حویلی ہی کو بندش لگا کر جائے ممنوعہ میں تبدیل تو کر دیا ہے، لیکن وہ اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں ہے، لہذا اسے جہاں سے بھی ایک ذرا سی بھی درز، یا کوئی ایسی جھری ملی کہ جس سے وہ پھر سے خود کو اس ماحول میں تحلیل کر سکے تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بنا، اپنی پوری طاقت سے اس موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے میں اگر ذرا سی بھی کوئی خلاف معمول حرکت، یا بات محسوس کروں تو فوراً انہیں مطلع

کردوں۔ میں اسی فکر میں اپنے ذہن کے ریشتے ادھیڑ تار ہا اور رات بھیکتی گئی۔ شاید ساڑھے تین کے آس پاس کا کوئی وقت ہوگا کہ اچانک ہی میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ وہی مخصوص سی خوشبو مجھے اپنے اطراف تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے کئی بار سر جھٹک کر خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی یہ میرا وہم ہے۔ سلطان بابا نے پوری حویلی کے گرد ایک غیر مرئی آہنی دیوار اٹھا رکھی تھی، جس میں کوئی چھید، کوئی نقب لگانا ناممکن تھا تو پھر یہ خوشبو کیسی.....؟ اچانک باہر والا ان میں کوئی کھٹکا سا ہوا۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ آواز پتیل کے پیڑ کی جانب ہی سے آئی تھی۔ میں نے چند لمحے سلطان بابا کے کمرے کی جانب سے کسی حرکت کی توقع میں انتظار کیا، لیکن اسی اثناء میں دوسرا کھٹکا ہوا اور میرے قدم میکا کی انداز میں باہر کی جانب اٹھ گئے۔ میں نے برآمدے کا دروازہ کھولا تو سرد بھگی ہوا کے ایک جھونکے نے میری سوئی ہوئی روح تک کو پہلی سلامی دے کر جگا دیا۔ باہر والا ان میں بھی وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اس کی مہک کی شدت اندر برآمدے سے کہیں زیادہ تھی۔ میں جلدی سے ننگے پاؤں ہی باہر نکل آیا تھا۔ گھاس پر جمی شبنم کے قطرے کسی تیز برچھی کی نوک کی طرح میرے ٹکڑوں میں پیوست ہو کر میرے وجود کو چھیدتے ہوئے میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ خوشبو مجھ سے کہہ رہی ہے۔

تیری ہر چاپ سے جلتے ہیں خیالوں میں چراغ  
جب بھی تو آئے..... جگاتا ہوا جادو آئے  
تجھ کو چھو لوں تو پھر اے جان تمنا  
مجھ کو دیر تک اپنے بدن سے تیری خوشبو آئے

پتیل کے پیڑ کی جانب سے ایک آہٹ بلند ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا، کسی کا نازک وجود فضا میں پھیلی دھند اور کہرے پر تیرتا ہوا سا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری بصارت کو اپنی دو آنکھوں میں سمو کر کہرے کی اس سفید چادر کو چیرنے کی کوشش کی۔ سیاہ لباس میں ملبوس اس نازنین کا آنچل ڈھلکا اور میرے وجود میں روشنی کے کئی مینار پھوٹ پڑے۔ میرے سامنے زہرا بے نقاب کھڑی تھی۔ ہاں..... وہی..... میری اپنی..... زہرا۔





## صلیب عشق

ہاں وہ زہرا ہی تھی اور وہی اس کا روح کے اندر تک جذب ہو جانے والا حسن تھا لیکن وہ یہاں سینکڑوں میل دور، رات کے اس سناٹے میں کیا کر رہی تھی۔ وہ مجھے یونہی ایک تک دیکھتی رہی۔ دفعۃً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا وجود ایک پل میں ہی کٹی من بھاری ہو گیا ہے۔ میرے کاندھوں میں اس اچانک بوجھ کی وجہ سے شدید درد اٹھا لیکن شاید میں زہرا کو اپنے سامنے پا کر یہ سب بھول ہی گیا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ”آپ یہاں.....؟“ اس وقت..... لیکن کیسے.....؟“ زہرا اپنی مخصوص سی دھیمی مسکراہٹ اپنے کول ہونٹوں میں دبا کر بولی۔ ”کیوں..... میں یہاں نہیں آ سکتی.....؟ کیا سبھی کرامات صرف آپ کے لیے ہی مخصوص ہیں.....؟“ میں لا جواب سا ہو گیا لیکن میری الجھن فزوں تر ہوتی گئی..... ”لیکن پھر بھی..... میرا مطلب ہے.....؟“ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”بس اور کچھ نہ کہو..... جانے کتنی صدیوں سے تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے میری یہ پیاسی آنکھیں، خشک اور بخر پڑے ہیں۔ خاموش رہو اور میرے من پر اپنی شبیہ کا ساون برسنے دو.....“ میں نے چونک کر زہرا کو دیکھا۔ اس نے آج تک کبھی مجھے ”تم“ کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اس کی محویت اور بے خودی کا یہ عالم تھا کہ اس وقت وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم پتیل کے پیڑ کی اوٹ میں آئے سامنے بیٹھ گئے۔ جو لوگ زندگی میں اس صلیب عشق پر اپنا وجود وار چکے ہیں وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ خاموشی اور تنہائی کے ایسے چند لمحے جب ہونٹ خاموش ہوتے ہیں اور صرف سانس بولتی ہیں۔ یہ لمحے سات جنم میں بھی صرف ایک آدھ بار ہی کسی نصیب والے کا مقدر بنتے ہیں۔ لیکن کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں کہ ہماری روح ان سے کبھی سیراب نہیں ہوتی، جن سے ہماری آنکھیں کبھی نہیں ٹھکتیں۔ جن کو نہانے کے دوران ہمیں اپنی پلکیں سوندھنے کا وقفہ بھی صدیوں جیسا لبا اور اذیت ناک لگتا ہے کہ جس مقام پر پہنچ کر ہمیں دنیا میں آنے کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور جس کے بعد اپنی پہلے گزری اور بعد میں بسر ہونے والی ساری زندگی صرف اور صرف وقت کا غیاب ہی لگتی ہے۔ وہ لمحہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نہ جانے ہم دونوں کتنی دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے میرا تمام حافظہ میرے ذہن کی سلیٹ سے مٹ سا گیا ہے۔ صبح کی سپیدی پھیلنے سے کچھ دیر قبل وہ کھڑی ہوئی۔ ”اب میں چلتی ہوں..... کل پھر اسی وقت یہیں ملاقات ہوگی لیکن دھیان رہے..... میرے یہاں آنے کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہئے..... ورنہ میرا یہاں آنا مشکل ہو جائے گا.....“ میری زبان سلب ہی رہی اور وہ دھیرے دھیرے دھند کی چادر میں بہتی ہوئی اندھیرے کا حصہ بن گئی۔ میرا جسم تپ رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آ کر اپنے بستر پر گر گیا اور صبح جب میں فجر کی نماز قضا ہو جانے کے باوجود سلطان بابا کے کمرے میں نہیں گیا تو روشنی ہونے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے اور میرا جسم چھوتے ہی انہیں میرے شدید بخار کا پتا چل گیا۔ حاجی رزاق تو بالکل ہی بوکھلا گئے اور میں نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اپنے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیوں کی سرد لہر محسوس کرتا رہا جو شاید

حاجی رزاق کا نوکر وقتے وقتے سے میرے ماتھے پر رکھ رہا تھا۔ عصر تک میری جان میں کچھ جان آئی۔ آنکھیں کھولیں تو سلطان بابا کو اپنے سر ہانے متشکر سا بیٹھا دیکھ کر میں نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ ”لیئے رہو میاں..... یہ بخار اچانک کہاں سے پال لیا.....؟“ میں نے انہیں رات کا واقعہ بتانے کی کوشش کی لیکن میرے لفظ کھو سے گئے تھے۔ شدید جھکن اور نقاہت کے مارے میرے منہ سے صرف ”ہوں، آں“ کے علاوہ کچھ نہیں نکل پایا۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ میں گھٹن محسوس کر رہا ہوں، لہذا مجھے باہر کھلی فضا میں لے جائیں۔ باہر شام کی ٹھنڈی ہوائ نے میرے حواس کافی حد تک بحال کر دیئے۔ باہر اس وقت سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ہاں البتہ ایک بات ضرور خلاف معمول تھی۔ آج رباب بالکل پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ میری کرسی دالان میں جہاں ڈالی گئی تھی وہاں سے میں عامر اور اس کے ڈاکٹروں کی ٹیم کو اپنی پہلی کامیابی پر خوشی مناتے ہوئے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ عامر اپنے سر کو یقین دلا رہا تھا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ خاص نفسیات کا مسئلہ ہے۔ آپ نے دیکھا، ڈاکٹر ذاکر کے کل کے پہلے ہی ڈور نے کتنا اثر ڈالا ہے اور آج رباب کس قدر پرسکون ہے.....؟..... آپ خواہ مخواہ ہی دوسو سو میں پڑے ہوئے تھے، دنیا کی ایسی کوئی بیماری نہیں ہے جس کا علاج سائنس کے پاس نہ ہو۔“ حاجی رزاق کے چہرے پر بھی اطمینان کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے رباب دالان کی طرف نکلی تو میری نظر دور سے اس کے شانت وجود پر پڑی۔ اچانک وہ پلٹی اور اس کی نظر میری نظر سے ملی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کئی گز دور ہونے کے باوجود اس کی وہ دو بڑی کالی اور سلگتی ہوئی سی آنکھیں بالکل میری گھائل آنکھوں کی پلک سے پلک جوڑے مجھے گھور رہی ہیں۔ وہ چند لمحے مجھے یونہی دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر اندر چلی گئی۔ اور میرا جسم پھر سے اسی بے پناہ بوجھ تلے دبنا گیا لیکن میں پھر چاہے کبھی سلطان بابا کو کچھ نہیں بتا پایا۔ وہ میری بیماری کی وجہ سے پہلے ہی کافی پریشان تھے اور میں ان کے چہرے پر مستقل ایک بے چینی اور فکر کا سایہ دیکھ رہا تھا۔ جب بھی میری ان سے نظر ملتی وہ مجھے میرے چہرے پر کچھ ڈھونڈتے سے ہوئے نظر آتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ ہی دیر بعد ان کی کھوجتی نظر سے کچھ خوف سا محسوس کرنے لگا تھا۔ لہذا مغرب کے قریب میں سر دھوا کا بہانہ کر کے وہاں سے اندر اپنے کمرے میں اٹھ آیا۔ میرا رواں اس وقت آدھی رات کا وقت جلد از جلد ہونے کے انتظار میں جلا جا رہا تھا لیکن یہ ستم گروقت تھا کہ لمحوں کو صدیوں میں تبدیل کر کے کٹار ہا۔ اوپر سے سلطان بابا کی وہ کڑکٹی نظر، جو مجھے اپنے وجود کے اندر گڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں نے سکون کی سانس لی لیکن وقت ٹالنے کا جان لیوا سر حلہ اب بھی ویسے ہی درپیش تھا۔ میں دھیرے دھیرے سے اٹھ کر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا اور اپنی نظروں میں سات جنموں کا انتظار لے کر اس جانب دیکھنے لگا جہاں سے کل رات زہرا آئی تھی اور پھر وہی گھڑی کی ٹک ٹک اور وہی میری پلکوں کی سوئیاں..... شاید میری قضا سے کچھ لمحے پہلے وہی آہٹ ابھری اور میں یوں لپک کر باہر نکلا کہ جیسے شدید پیاس میں دم توڑنے والے کسی زخمی کے لب پانی کے آخری بچے ہوئے قطرے کے لیے کھلتے ہیں۔ باہر وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں تیز قدموں سے پتیل کے پیڑ کے عقب میں پہنچ گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں میری سماعتوں کو نئی زندگی بخشنے والی قدموں کی چاپ ابھری جو ہمیشہ ہی میرے دل کی دھڑکنوں کو اٹھل پھل کر دیتی تھی۔ زہرا اسی جانب سے چلتی ہوئی آئی اور آ کر میرے مقابل کھڑی ہو گئی اور گزشتہ رات ہی کی طرح میں پھر سے وہ سارے سوال بھول کر مہوت سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جتنی مرتبہ زہرا میرے سامنے آئی تھی، چاہے درگاہ میں، یا چاہے کہیں اور..... ہر بار میری یہی حالت ہوتی تھی۔ اس کے یا تو قی لب



ہلے اور میرے کان میں جیسے پھر سے وہی انجان سرگوشی سی ہوئی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی اور بولی ”یا قوط..... تم آگئے..... کتنا انتظار کروا تے ہو.....“ میں چونکا لیکن اس کی وہ جان فزا مسکراہٹ مجھے کب کچھ سوچنے دیتی تھی۔ وہ دو قدم بڑھا کر میرے اور قریب آگئی اور اس کی مہکتی ہوئی سانسیں میری شررگ کو چھو کر میری رگ جان میں ایک نئی زندگی بھر گئیں۔ جانے لوگوں نے زندگی کو صرف سانس لینے سے کیوں متصل کر رکھا ہے۔ زندگی تو کچھ اور شے ہے۔ سانس لینے اور جینے سے بہت بڑھ کر، بہت سوا ہے، جیسے زہرا کے میرے قریب آنے کا دلچہ۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں زندگی کی وہ لہر اپنی روح میں سینچتا، ایک چنگھاڑتی ہوئی دھاڑ سنائی دی۔ ”عبداللہ.....“ میں گھبرا کر پلٹا اور سلطان بابا کو اپنے پیچھے غصے میں تھناتے ہوئے آتے دیکھا۔ زہرا نے ڈر کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”یہ شخص ہمیں جدا کرنے آ رہا ہے یا قوط..... مجھے اس سے بچالو..... بچالو مجھے۔“ میں نے بھی زہرا کو بچانے کی خاطر خود کو اس کی ڈھال بنالیا۔ سلطان بابا کی آنکھوں سے غصے کے مارے چنگڑیاں سی نکل رہی تھیں۔ وہ میرے قریب آئے اور بنا کچھ کہے ان کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے گھوم کر میرے چہرے پر ایک زوردار چاٹنے کا نشان چھوڑ گیا۔ تھپڑ تھا، یا کوئی بجلی کا جھٹکا، ایک ہی لمحے میں میرا سر کچھ اس طرح چکرایا کہ مجھے ساری دنیا ہی گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زمین پر گرنے سے پہلے میری بند ہوئی آنکھوں نے پلٹ کر زہرا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں رباب کو کھڑے دیکھ کر میرے رپے سہے حواس نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میرا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر ہی موجود تھا لیکن میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے بیک وقت کسی نے سینکڑوں سوئیاں پرو دی تھیں۔ سلطان بابا میرے سر ہانے ہی آنکھیں موندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آہٹ ہونے پر انہوں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ ”اب کیسی طبیعت ہے میاں.....؟“ میں کچھ بول نہیں پایا۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد تھا کہ رات کو میں زہرا کے قریب کھڑا تھا اور پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ لیکن رباب وہاں کہاں سے آ پہنچی تھی۔ سلطان بابا نے میری آنکھوں میں ابھرتے سوال پڑھ لیے اور گہری سی سانس لے کر بولے۔ ”شکست انسان کا مقدّر تب بنتی ہے جب وہ اپنے قلعے کی ہر درز، ہر روشن دان، ہر دروازے پر پہرے بٹھا کر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، بنایا جانے کو وہ جن پہرے داروں کو پہرے پر چھوڑ آیا ہے دشمن انہی میں سے اپنا راستہ تلاش کرنے کی دھن میں ہے۔ اس نے تنہی پر کند ڈال کر میرے قلعے میں نقب لگائی ہے میاں..... بڑی بھول ہو گئی مجھ سے..... سبھی جگہوں پر بندش لگا دی لیکن تمہیں بھلا دیا۔ سچ ہے، انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے.....“ میں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا۔ اتنے میں باہر سے رباب کی چیخیں بلند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور پتا چلا کہ اس کی حالت پھر سے بری طرح بگڑ چکی ہے۔ سلطان بابا کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ انہوں نے نے بتایا کہ شاید جس وقت میں رباب کی کھڑکی کے سامنے کھڑا اسے ڈاکٹروں کے زمرے میں تڑپتا ہوا دیکھ رہا تھا اور کچھ لمحوں کے لیے میرا دل رباب اور یا قوط کی ماورائی سی محبت کے لیے نرم پڑ رہا تھا، شاید اسی وقت اس نا دیدہ ہستی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے سلطان بابا کے آہنی حصار میں کہاں سے نقب لگانی ہے اور اسی رات اس نے میرے وجود پر اپنا قبضہ مضبوط کر لیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ رباب جو جانے کب سے یا قوط کو کسی سانچے، کسی روپ میں دیکھنے کی خواہش میں فنا ہوئی جا رہی تھی اسے بھی اپنے محبوب کو کسی انسانی صورت میں اپنی آنکھوں سے نہارنے کا موقع مل گیا۔ میرے حواس کو اس زور آور ہستی نے کچھ اس طرح سے جکڑا کہ خود مجھے بھی رباب نہیں، زہرا ہی دکھائی دی۔ بقول سلطان بابا وہ مجھے وہی کچھ دکھا رہا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے من میں بے عکس کو ہی اس نے

رباب کے وجود کے آئینے سے بدل کر رباب کو زہرا کی صورت میں مجھے دکھایا۔ جس وقت سلطان بابا میرے ساتھ ہوئی اس ”واردات“ کی خبر مجھے سنار ہے تھے اس وقت بھی میرا پورا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔ یہ جذبے کیا اتنے طاقت ور بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ہمارے جسم میں، ہماری رگوں میں داخل ہو کر اور ہماری نسلوں میں خون بن کر اس طرح دوڑ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے اندر کی ساری فزیا لوجی بدل سکتے ہیں؟ بظاہر اس کے علاوہ مجھے اپنے بخار کی اور کوئی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں سلطان بابا سے بھی شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا کیوں کہ ان کی ساری محنت صرف میرے اس کمزور وجود کی وجہ سے مٹی میں مل گئی تھی۔ دوسری طرف باہر والا ان میں عام اور باقی سارے ڈاکٹروں کی ٹیم اس بات کی کھوج میں اپنا سر پیٹ رہی تھی کہ آخر ۲۴ گھنٹے میں ہی ایسی کیا کایا پلٹ ہوگئی کہ سب کچھ ٹپٹ ہو کر رہ گیا تھا اور رباب ایک بار پھر سے مجھے سے اکھڑ گئی تھی۔ جیسے جیسے شام ڈھلنے لگی میرے اندر بے چینی کی سیوئیاں پیوست ہوتی گئیں اور مکمل اندھیرا ہونے تک میں خود آگ سے بنا ایک آتش فشاں بن چکا تھا۔ میرے وجود کا قابض اپنے خونخوار نچے میری روح میں دھیرے دھیرے گاڑ رہا تھا اور کرب اور بے چینی سے میں اپنا سر ادھر ادھر پٹخ رہا تھا۔ وہاں رباب کی بھی یہی حالت تھی۔ سلطان بابا دو قدم میرے دروازے میں رکتے تو اگلے ہی لمحے حاجی صاحب کے بلاوے پر انہیں اندر زنانے کی طرف دوڑ لگانا پڑتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود کے اندر قطرہ قطرہ کر کے کوئی سیاہ سیال مادہ ٹپکایا جا رہا ہے جو میرے سرخ خون میں شامل ہو کر میرے وجود کے اندر تار کی بھر رہا ہے۔ میری سانسیں غراہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سب کچھ جس نہیں کر دوں۔ میری حالت دیکھتے ہوئے سلطان بابا نے نوکر کو میرے کمرے کا دروازے باہر سے بند کرنے کی ہدایت کر دی۔ کیوں کہ انہیں خود رباب کی حالت کے پیش نظر زنانے کی طرف بھی توجہ دینا پڑ رہی تھی۔ آخر کار آدھی رات ٹھیک اس لمحے جب میں گزشتہ رات رباب سے ملنے کے لیے والاں کی طرف گیا تھا، میری آواز بھی میرے لیے اجنبی ہو چکی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ خود میرے اندر سے اس غراہٹ بھری آواز میں کوئی اور بول رہا ہے۔ میں زور سے چلایا: ”سلطان بابا.....“ کچھ ہی دیر میں بابا کمرے میں داخل ہوئے تو گھبرائے ہوئے سے حاجی رزاق بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن تب مجھے پتا چلا کہ جانے میری غنودگی کے کس لمحے میں حاجی صاحب کے نوکر سلطان بابا ہی کی ہدایت پر میرے ہاتھ میری پشت پر پٹنگ کی لوپے والی جالی کے ساتھ باندھ چکے ہیں۔ میں نے زور سے خود کو جھٹک دیا اور بولا، لیکن وہ لفظ میرے تھے اور نہ ہی وہ لمحہ..... ”آپ اپنی سی ہر کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ چند لمحوں کی یہ عارضی قید مجھے میری راہ سے ہٹا پائے گی.....؟“ میں ہر قید توڑ کر اپنی منزل تک پہنچوں گا۔ اب یہ میرا آپ سے وعدہ ہے..... آپ مجھے روک سکیں تو روک لیں.....“

سلطان بابا غصے سے گرے۔ ”مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ اب یہ کھیل زیادہ عرصہ نہیں چلے دوں گا میں.....“ میں زور سے ہنسا۔ ”اچھا.....؟ تو پھر کیا کریں گے..... اپنے اس پیارے شاگرد کو مار ڈالیں گے.....؟ یاد رکھئے اب میں اس کے جسم سے کہیں نہیں جانے والا.....“ مجھے اس کے جسم سے نکالنے کے لیے آپ کو اپنے اس عزیز کے جسم نازک کو اتنی اذیت دینا ہوگی کہ اس کی سانسیں ہی بند ہو جائیں۔ صرف اس کا مردہ جسم ہی میرے اخراج کا باعث بن سکتا ہے۔ تو پھر کہیں.....؟ ہے ہمت اپنے شاگرد کو قربان کرنے کی.....؟“ سلطان بابا نے غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کانٹے اور میں دیوانہ دار قہقہے لگاتے لگاتے دروازے پر چینی سے بے سدھ ہوتا چلا گیا۔ جانے یہ نیند بھی کیسی راحت لکھی ہے قدرت نے ہمارے نصیب



میں۔ درد چاہے کتنا ہی شدید اور مار دینے والا کیوں نہ ہو، یہ ایک مہربان ماں کی طرح اپنی گود میں تھپک تھپک کر ہمیں سلا ہی دیتی ہے اور کچھ وقت کے لیے ہی سہی لیکن ہم اپنا غم، ہر دکھ، درد بھلا کر کسی معصوم بچے کی طرح اس بے رحم دنیا کی گھاتوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کاش ہم ساری زندگی ہی یوں ہی سو کر گزار سکتے تو اپنے دامن پر لگے ان گنت داغوں کی کالک سے تونچ جاتے۔ لیکن افسوس ہر اچھی چیز کی طرح یہ کم بخت نیند بھی ہم سے دامن چھڑا ہی لیتی ہے۔ سو مجھ سے بھی وہ بے وفا اپنی آنکھیں چرا گئی اور میری آنکھ کھلی تو کمزوری اور نقاہت سے میری پلکیں اٹھنا بھی میرے لیے دوپھر ہو چکا تھا۔ میرے قریب ہی وہ بزرگ پریشان، میرے ہدم، سلطان بابا چپ چاپ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اپنی کلائیوں میں جھپٹا کر سوزش کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا تو کٹھن جیسے گہرے سرخ نشان پڑے ہوئے تھے جن میں سے ہلکا ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ سلطان بابا نے میرے ہاتھ تھام لئے۔ ”مجھے معاف کر دوسرا حرمیاں۔ کل رات تمہاری حالت کے پیش نظر میں نے ہی تمہیں باندھنے کا حکم دیا تھا ان لوگوں کو۔“ میں نے تڑپ کر ان کے مہربان ہاتھ سختی سے جکڑ لئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا یہ بوسیدہ جسم اگر آپ کی راہ کی رکاوٹ بن رہا ہے تو آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ اسے جلا کر ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں..... لیکن پھر کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالے گا۔“ ان کی آنکھیں شاید زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے بھیگی ہوئی دیکھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اندھیرا ہونے کے ساتھ ہی میرے وجود پر اس عفریت کا سایہ قابض ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ فجر سے لے کر مغرب سے کچھ پہلے تک میں اپنے آپ میں رہتا تھا اور پھر میرا یہ جسم میرے لیے پرایا ہو جاتا تھا۔ میرے ذہن میں سوال ابھرا ”تو پھر اس وقت میں خود کہاں ہوتا ہوں؟ کیا خود اپنے ہی ذہن کے کسی پوشیدہ اور خوابیدہ گوشے میں میرا شعور جا چھپتا ہے اور میں خود بھی خواب کی کیفیت میں چلا جاتا ہوں؟“ مجھے خود سے زیادہ سلطان بابا کی فکر تھی۔ وہ تو رباب کو اس سائے سے بچانے کے لیے آئے تھے اور یہاں خود ان کا اپنا شاگرد بھی ان کے لیے عذاب بنتا جا رہا تھا۔ مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں خود کو کس طرح سے ان کی راہ کا پتھر بننے سے روکوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے اس وجود کی وجہ سے ہی یا قوت سے شکست کھا رہے تھے کیونکہ میرا جسم ان کی راہ میں حائل تھا۔ وہ مجھے اذیت نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ اب تک جانے وہ کیا کچھ کر گزرے ہوتے اور یا قوت کو میرے جسم سے نکالنے کا واحد ذریعہ اب شدید اذیت ہی رہ گیا تھا۔ لیکن میں انہیں اس طرح ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ان کی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں سے مس کیں۔ ”میری ایک بات مانیں گے بابا.....“ انہوں نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے ان کی بھیگی پلکوں پر ٹھہرے موتیوں کو دیکھا۔ ”آپ مجھے مار ڈالیں۔ ختم کر دیں مجھے..... اگر یہی ایک ذریعہ ہے اسے میری روح کے اندر سے نچوڑنے کا۔ تو آج میں اسی وقت آپ کو اپنا خون معاف کرتا ہوں لیکن دیر نہ کریں۔ آپ کا مقصد نیک ہے اور بلا جھجک اپنا فرض ادا کریں۔“ انہوں نے میرا سراپے کا منہ سے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں..... تم میرے لیے کسی حد تک بھی جاسکتے ہو لیکن بات صرف فتح اور شکست کی نہیں ہے۔ کچھ جنگیں صرف فتح پانے کی غرض سے نہیں لڑی جاتیں اوروں کا بھی، بہت کچھ لگا ہوا ہے اس داؤ پر بس اتنا یاد رہے کہ ابھی ہم دونوں کو بہت اذیت چھلنی ہے لیکن ہم آخری سانس تک مقابلہ کریں گے.....“ وہ میرا سر تھپکتے رہے اور میرے بے بس آنسو ان کے شانے کو بھگوتے رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی سانس روکنے کا کوئی بندوبست کر لوں گا۔ لیکن اب انہیں مزید پریشان نہیں کروں گا۔ مجھے رباب کا خیال آیا اور میرے من میں عجیب سی سوچ آئی۔

تم ہو اوروں کی محفل میں مصروف  
یہاں میں ہوں اور عالم تنہائی  
اب لوگ مجھے تیرے نام سے جانتے ہیں  
جانے یہ میری شہرت ہے یا رسوائی؟

وقت ڈھل رہا اور پھر سے وہی قاتل رات میرے سامنے اپنے خون آشام جہڑے کھولے آکھڑی ہوئی۔ میری رگوں میں وہی بے رحم، سفاک اور جلا دینے والی آگ، انگارے بھرتی گئی۔ میری سانس بھرتی گئی اور کچھ ہی دیر میں میری نس نس سے چکاڑیاں سی نکلتی گئیں۔ آج میرے جنون کا یہ عالم تھا کہ بان کی بنی ہوئی وہ موٹی رسی بھی میری راوی کی رکاوٹ بننے میں ناکام ہو رہی تھی لہذا ایک ٹوکڑ کہیں سے ایک موٹی سی فولادی زنجیر اٹھالیا اور آٹھ دس بندوں نے مجھے جکڑ کر میرے پیروں میں اس زنجیر کی بیڑی ڈال دی۔ جنوں، نفس اور ابھتی بیڑیاں..... یہ تو اس بے رحم قدرت کا پسندیدہ کھیل تھا جو وہ ازل سے ہم بے بس اور لاچار انسانوں کے ساتھ کھیلتی آ رہی تھی اور شاید ابد تک یہ بے رحم تماشا جاری رہنے والا تھا۔ میری حالت دیکھ کر خود حاجی رزاق بھی رو پڑے اور انہوں نے کسی کے ذریعے عامر کو خبر کروادی کہ وہ بھی آ کر میری دیوانگی کا یہ نظارہ دیکھ لے اور اگر اس کی سائنس میں اس جنوں کی بھی کوئی توضیح موجود تھی تو وہ بھی بیان کر جائے۔ لیکن ناصح بھلا کیا جانے کہ زخم کے بھرنے سے پہلے ہی ہم جیسے دیوانوں کے ناخن ہمیشہ بڑھ آتے ہیں۔ عامر نے میری حالت دیکھی تو اسے بھی ایک چپ سی لگ گئی۔ سلطان بابا میرے قریب ہی بیٹھے بار بار کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہے تھے۔ ان کی ہر پھونک سے چند لمحوں کے لیے میرے جلتے ہوئے وجود پر ایک ٹھنڈی پھواری تو ضرور پڑ جاتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے وہ روح کے ریشے تک جلا دینے والی تپش پھر سے میرے جسم کو گھیر لیتی تھی۔ میرے اندر کی بے چینی مستقل مجھے رباب کے کمرے کی جانب کھینچ رہی تھی۔ میرے اندر سے طاقت کا ایک لاوا سا ابلنے کے لیے جیسے اپنا پورا زور لگا رہا تھا لیکن میرے اپنے جسم کی لاچاری، کمزوری اور بوسیدگی اس طاقت کا ٹھیک استعمال نہیں کر پا رہی تھی۔ ورنہ میں کب کا اس زنجیر کے ٹکڑے کر کے وہاں سے نکل چکا ہوتا۔ عامر حیرت کے عالم میں گنگ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا سلطان بابا کی بیگی آنکھیں دیکھ کر وہ بھی بے چین سا ہو گیا۔ ”آپ اسے کھول دیں ورنہ یہ خود کو کوئی نقصان پہنچا کر ہی دم لے گا۔“ سلطان بابا نے غور سے عامر کی جانب دیکھا۔ ”عبداللہ کا انسانی جسم یہ عذاب زیادہ دیر تک جھیل نہیں پائے گا۔ کیونکہ ہمارے اس فانی جسم کے برداشت کی اپنی کچھ حدیں ہیں اور چونکہ اس وقت وہ عبداللہ کے جسم کی حدود کا محتاج ہے اس لیے وہ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح اسی جسم کی آڑھ میں رباب تک پہنچ سکے۔ لیکن اگر اس نے زیادہ زور لگایا تو لوہے کی یہ بیڑیاں عبداللہ کے جسم کے ریشوں میں سے گزر کر اس کی ہڈیوں کو چیر کر رکھ دیں گی۔ مگر تم فکر نہ کرو..... جب تک میرے اس پیارے کے جسم میں زندگی کی ایک بھی رت باقی ہے میں تمہاری سنگیتر تک اسے نہیں بچنے دوں گا۔ تم بس اپنے رشتے کو کمزور نہ پڑنے دینا.....“ عامر نے زور سے سر ہلایا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا..... لیکن..... لیکن یہ بھی تو پاگل پن ہے..... نہیں..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ عامر کو یکایک نہ جانے کیا ہوا وہ بھاگتا ہوا مہمان خانے سے نکل گیا اور کچھ دیر بعد ہی میری جلتی ہوئی روح پر کسی نے جیسے ٹھنڈے پانی کی آبشار بہادی۔ عامر رباب کا ہاتھ پکڑے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ رباب کے بال نکھرے ہوئے تھے اور وہ نہایت لاغر اور کمزور لگ رہی تھی۔ اس نے رباب کو ایک



زور کا جھک دیا اور وہ میرے قدموں کے قریب ہی ڈھے گئی۔ عامر زور سے چلایا۔ ”یہ لو..... میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ اب خدا کے لیے ہمیں بخش دو۔ مار ڈالو اسے اور یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“ رہاب کے پیچھے ہی اس کی ماں اور بہن بھی دوڑتی ہوئی چلی آئی تھیں اور اس وقت حاجی رزاق سمیت وہ سب دم سادھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے سائنس کی طاقت کو حتمی علاج ماننے والے ایک انسان کے عقیدے نے اپنا کانچ کا بھرم توڑ ڈالا تھا۔ جیسے ہی میری رہاب پر نظر پڑی میری ساری بے چینی، ساری تپش، ساری آگ پل بھر میں سرد ہو گئی تھی۔ وہ بھی بنا پلک جھپکائے میری جانب دیکھتی رہی۔ میرے لب ہلے۔ میں نے سلطان بابا کی جانب نظر اٹھائی۔ ”انسانوں کی سنگ دلی کے قصے تو بہت سنے تھے۔ ان کی بے رحمی اور مکاری کے افسانے بھی عام ہیں لیکن آج دیکھ بھی لیا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری محبت جسم کی حدوں سے بہت آگے کی ہے۔ یہ روح سے روح کا مقدمہ ہے۔ لیکن آپ نے اپنے علم کی دھماک بٹھانے کے لیے خود اپنے عزیز شاگرد کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کا یہ نازک اور کمزور انسانی جسم زیادہ عرصے تک میرا وجود نہیں جھیل پائے گا لیکن پھر بھی آپ اپنی ضد سے باز نہیں آئے۔ اب بھی وقت ہے مجھے آزاد کر دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میری محبت میں خیر ہے..... اسے شرم میں بدلنے کی کوشش نہ کریں..... اب تو اس کا سب سے بڑا دعویٰ دار بھی اس کے حق سے دست بردار ہو گیا ہے.....“

سلطان بابا کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے میری جانب دیکھتے رہے پھر جیسے کسی حتمی فیصلے پر پہنچ کر انہوں نے اپنا سر اٹھایا۔

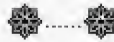
”ٹھیک ہے..... میں اس لڑکی کی روح پر ہمیشہ کے لیے تمہارا تسلط برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں..... میں، یا کوئی بھی اور، کبھی بھی تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گا لیکن میری بھی ایک شرط ہے.....“

ہم سب نے ہی چونک کر سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ حاجی رزاق اور ان کے پورے خاندان کا عامر سمیت پریشانی کے مارے رنگ ہی اڑ گیا۔ حاجی صاحب ہکلائے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں قبلہ..... اس طرح تو.....“

سلطان بابا نے ہاتھ اٹھا کر حاجی رزاق کو روک دیا اور میری جانب متوجہ ہوئے۔

”ہاں..... تو بولو..... منظور ہے یہ سودا.....“



## ابھی کچھ دیر باقی ہے

سلطان بابا نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ ”بولو..... ہمت ہے ایک انسان کی کسوٹی پر پورا اترنے کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ہم انسانوں کی مکاری اور ہمارے ظالم اور جابر ہونے کے بارے میں کہا تھا، لیکن اب ان میں سے ہی ایک انسان تم سے تمہارا وعدہ مانگ رہا ہے۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ تم جیتے تو رباب تمہاری اور اگر میں جیتا تو تمہیں یہ بے سیرا ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانا ہوگا اور یاد رہے، میرے اور تمہارے درمیان ضامن صرف وہی ہوگا جو ہم دونوں کا پر در گار ہے..... یعنی میرا اور تمہارا اللہ.....“

کچھ دیر تک کمرے میں گھمبیری خاموشی طاری رہی۔ پھر میرے لب ہلے۔ ”ٹھیک ہے مجھے آپ کی شرط منظور ہے..... بتائیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

سلطان بابا نے ایک لمبی سے سانس لی۔ ”تم اس لڑکی سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور تمہارے بقول یہ خود بھی تمہاری محبت میں شدید طور سے مبتلا ہے۔ تمہیں یہی بات ہم سب پر ثابت کرنا ہوگی۔ اگر میری بات سچ نکلی اور یہ تمہارے سحر کے زیر اثر ہوئی تو تمہارا دعویٰ خود بخود غلط ثابت ہو جائے گا۔ تمہیں ایک بار اسے مکمل آزاد کر کے کسی بھی روپ میں اس کے سامنے آنا ہوگا۔ اگر رباب یا قوط کے عشق میں مبتلا ہوئی تو اسے تمہیں قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن یاد رہے، اس وقت اس کے ذہن اور دل پر تمہارا کوئی اثر باقی نہیں ہونا چاہئے۔ بولو..... منظور ہے یہ کسوٹی.....“

میں نے الجھن آمیز انداز میں سر ہچکا۔ ”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ جانتے ہیں میں اپنی ظاہری شکل و صورت میں اس کے سامنے نہیں آ سکتا۔ یہ ڈر جائے گی اور پھر آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ یہ صرف روح سے روح کے تعلق کا معاملہ ہے۔ میری روح کے دھاگے اس کی روح کی ڈور سے الجھے ہوئے ہیں۔ آپ ہماری محبت کو جسم اور ظاہری شکل و صورت کی بندشوں میں قید کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“ سلطان بابا بولے ”میں نے اسی لیے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم جس صورت میں بھی چاہو، اس کے سامنے آ سکتے ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ تم حسین سے حسین تر روپ دھار سکتے ہو۔ تمہارا دعویٰ تو روح سے روح کے ملاپ اور رشتے کا ہی ہے نا..... تو پھر اس کی روح تمہاری روح کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کرے گی اور اگر تب بھی رباب کے من نے تمہیں پہچان کر قبول کر لیا تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بات اس بار یہاں بھی چہرے اور جسم کی شناخت کی نہیں ہے..... دل سے دل کے رشتے کی پہچان کی ہے..... اگر تمہاری محبت سچی ہے اور تمہارا دعویٰ اٹل ہے تو پھر اسے اپنے تسلط سے آزاد کرنے میں خوف کیسا.....؟..... ایک بار تم نے اسے اپنی جانب خود کھینچا تھا، اب ایک بار خود اسے اپنی جانب بڑھنے دو..... ورنہ یہ مان لو کہ تم تسلط کے ذریعے اس کی محبت کو پانا چاہتے ہو۔“

کمرے میں ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ ہمیں اپنے مساموں سے پھوٹ کر جسم سے بہنے والے پسینے کی آہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ



دیر تک میرے اندر چپ کا سنا مارا۔ پھر جیسے میں نے خود بھی اپنے اندر ہتھیار ڈالنے کی جھنجھاری سنی اور میرے لب ہلے۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ یہی آپ کی ضد ہے تو مجھے آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ میں یہیں اس گھر میں رہا اب سے ملاقات کروں گا۔ مجھے امید ہے اس کے بعد آپ سب اپنے وعدوں کی پاسداری کریں گے۔۔۔۔۔ بس مجھے دو دن کی مہلت دے دیں۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ رہا اب اس نڈھال اور مضطرب حالت میں مجھ سے ملے۔۔۔۔۔ یہ اڑتالیس گھنٹے میں اس کی خاطر مانگ رہا ہوں۔ لیکن آپ کو بھی مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ ان دو دنوں میں کوئی بھی رہا اب کے کسی بھی فیصلے، یا طور طریقے پر کسی بھی طرح اثر انداز نہیں ہوگا۔ کوئی رشتہ بھی اس کی آزادی میں غل نہیں ہوگا۔“ غالباً یہ اشارہ عامر کی جانب تھا، یا پھر ایک ہاری ہوئی ماں سے کوئی خطرہ محسوس کر کے یہ ذیلی شرط لگائی گئی تھی؟ بہر حال سلطان بابا نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا ”ہوں۔۔۔۔۔ بے فکر رہو۔۔۔۔۔ رہا اب پر کسی بھی طرف سے اور کسی بھی رشتے کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ یہ سلطان کا تم سے وعدہ ہے۔“ اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی اور پھر میری آنکھ دوسرے روز دن چڑھے ہی کھل پائی۔ میری زنجیر کھولی جا چکی تھی۔ لیکن سلطان بابا کے چہرے پر ابھی تک فکر کی پرچھائیاں واضح تھیں۔ مجھے اٹھنے دیکھ کر انہوں نے پوچھا ”اب کسی طبیعت ہے میاں۔۔۔۔۔ کچھ دیر اور آرام کر لیتے تو بہتر ہوتا۔“ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے سوائے نقاہت کے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حالانکہ یا قوط کے لفظ میری زبان سے ادا ہوتے تھے اور اسی کی بولی میری باتوں کے ذریعے باقی سب تک پہنچتی تھی لیکن خود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ صبح اٹھتے ہی میرے حافظے کی سلیٹ بالکل صاف ہو جاتی ہے اور مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے رات کو کیا پیغام پہنچایا تھا۔ لہذا مجھے ایک بار پھر سے سلطان بابا سے کرید کرید کر ہر بات پوچھنا پڑتی تھی۔ میں نے پوری بات سن کر حیرت سے سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ ”لیکن آپ اس کی بات پر اس قدر اعتبار کیوں کر رہے ہیں؟ اگر یہ جنون ہے تو جنون کسی اصول کو بھی نہیں مانتا۔ جنون تو نام ہی اصولوں سے ہٹ جانے کا ہے۔“ سلطان بابا نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ”واہ میاں۔۔۔۔۔ بڑی بات کہہ دی آج تم نے۔ واقعی۔۔۔۔۔ جنون کو کسی اصول، کسی شرط، کسی وعدے کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔۔۔۔۔ مجھے اس کی شرط مان کر اس پر سے اپنا پہرہ آج شام سے پہلے اٹھانا ہی ہوگا اور بدلے میں اس کے وعدے پر اعتبار کرنا ہی ہوگا کہ وہ وقتی طور پر رہا اب کو اپنے سحر سے آزاد کر دے گا۔ ہمیں یہ جو اکھینا ہی ہوگا۔“ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کسی انجانے خطرے کے آثار ان کے لاکھ چھپانے کے باوجود بھی محسوس کر لیے اور اسی لمحے میں نے اپنے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ اگر اس مرتبہ یا قوط نے میرے جسم کے ذریعے انہیں ہرانے کی کوشش کی تو میں خود اسی لمحے اپنی جان لے لوں گا۔ لیکن کیسے۔۔۔۔۔؟ بس یہی ملے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

اس روز نرم دھوپ تلے کرسی ڈالے میں بہت دیر تک اپنی درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر آج تک کی زندگی پر غور کرتا رہا۔ مجھے اس متوازی دنیا کے دروازے پر ہی بتا دیا گیا تھا کہ اس کے اسرار اور رموز ہر ذی روح کا مقدر نہیں بنتے۔ آج مجھے اس رازداری کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ اسرار کبھی کبھی اتنے ہی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے تھے اور انسان کو ایسی جان کنی کی حالت تک بھی پہنچا سکتے تھے جس سے میں خود اس وقت دو چار تھا۔ کچھ دیر بعد عامر کے سینئر ڈاکٹروں کی ونی ٹیم بھی وارد ہو گئی جس میں ایک مشہور ماہر نفسیات بھی شامل تھا۔ وہ سبھی دالان میں بیٹھے عامر کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ یہ صرف مینافزکس (Metaphysics) کے کھیل ہیں۔ انہی میں سے پھر کسی نے اسی ڈائی پورل تصوری آف

گرے دی ٹیشر (Dipolar Theory of Gravitation) کا بھی ذکر کیا۔ عامران سب کے سوالوں اور بحث کے جواب میں انہیں لے کر میری طرف آ گیا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میں اب بھی مینافزکس کے کرشموں پر یقین رکھتا ہوں اور سائنس کی ہر تھیوری آج بھی اسی طرح مجھ پر واضح ہے۔ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے تناشے بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور ان پر میرا اعتقاد بھی..... لیکن کل رات جو میری نظروں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہے میں اسے کیسے جھٹلا دوں۔ رباب کے چہرے پر آج صبح سے چھائی ہوئی سرخی اور اس کی برسوں پرانی وہ مسکان بھی میرے سامنے سوالیہ نشان بنی کھڑی ہے..... آج اس کے جسم میں پھر سے بہتے خون کی حرارت محسوس کی ہے میں نے..... اور یہ جولا کا آپ کے سامنے اس وقت خاموش بیٹھا ہے، کل رات میں نے اس کے اندر خود وہ عفریت بھرا ہوا دیکھا ہے جو سب کچھ ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں سائنس پر یقین کروں، یا اپنی آنکھوں پر.....؟ کیا اب آپ لوگ یہ کہیں گے کہ یہ پورا گھر ہی کسی خواب کا حصہ ہے.....؟ کوئی تیرہ سو سال پہلے بھلیاں اسے گھیرے ہوئے ہے؟ یا پھر اس وقت بھی ہم کسی خواب کی کیفیت میں ہیں؟ ڈاکٹر لا جواب ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ پھر ہر نفسیات نے میری جانب قدم بڑھائے۔ ”کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تم اپنی کل رات کی کیفیت کو بیان کر سکتے ہو؟ کیا تمہارے ساتھ ایسا پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟ کیا تمہیں بچپن میں بہت سخت مذہبی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا.....؟ کیا تمہیں رباب میں کوئی ذاتی دل چسپی محسوس ہوئی ہے کبھی.....“ تو گویا وہ حضرت اب بھی اسے انسانی ذہن کا کوئی شعبہ سمجھ رہے تھے۔ میرے ظاہری حلیے کی وجہ سے وہ مجھے کوئی مذہب سے متاثرہ ان پڑھ سمجھ بیٹھے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ میں رباب کے ظاہری حسن سے متاثر ہو کر یہ سارا سچ تیار کر رہا تھا تا کہ آخر کار اسے پاسکوں۔ چند لمحوں کے لیے تو میرا ذہن غصے سے ابل سا ہی گیا۔ پھر مجھے ان کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ”کیوں جناب؟ کیا آپ کی مینافزکس کی ابتدا ہی مذہب پر شک کرنے سے ہوتی ہے.....؟ مذہب نے تو کبھی بھی آپ کی فزکس، مینافزکس، سائیکالوجی، پیراسائیکالوجی، یا کسی بھی قسم کی سائنس پر کوئی اعتراض نہیں کیا..... تو پھر آپ کا یہ شکوہ کچھ بے جا معلوم ہوتا ہے۔ میرا تفصیلی جواب سن کر عامر سمیت ان سب کے چہرے حیرت کا اشتہار بن گئے۔

پھر عامر کے منہ سے صرف اتنا نکلا ”کیا.....؟“ کیا تم پڑھے لکھے ہو.....؟“ مجھے یاد آیا کبھی یہی سوال میں نے عبداللہ سے بھی کیا تھا۔ میرا جواب بھی وہی تھا جو عبداللہ نے مجھے دیا تھا۔ ”ہاں..... یہاں آنے سے پہلے کچھ صفحے کالے کئے تھے، لیکن سب بے فائدہ ہی رہا.....“ اب ان کی ساری توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ”ابھی کچھ دیر پہلے تم مینافزکس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کیا تم نے سائنس پڑھی ہے؟“ ”پڑھی ہے لیکن اتنی ہی جتنا ایک طالب علم انٹر کے امتحان تک پڑھتا ہے۔ اس کے بعد تو بس کالج اور یونیورسٹی میں صرف وقت ہی ضائع کیا۔ لیکن یہاں معاملہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ ہم نہ جانے ہمیشہ سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کر کیوں کھڑا کر دیتے ہیں؟ مذہب اس لیے تو وارد نہیں ہوا تھا کہ وہ سائنس کو رد کرے..... مذہب تو خود علم کے راستوں پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور سائنس بھی تو ایک علم ہے..... اور کیا ضروری ہے کہ سائنس مذہب کی ہر بات کی تصدیق کرے؟ یاد رکھئے مذہب سائنس سے بہت پہلے آیا تھا، لیکن مذہب نے کبھی سائنس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تو پھر آپ سائنس کو کیوں مذہب کے راستے کی دیوار بنانا چاہتے ہیں؟ اور بھلا یہ کیا فارمولا ہوا کہ سائنس



مذہب کی جس پیشین گوئی کو ثابت کر دے وہ توح اور باقی سب غلط..... یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا سائنس کی بھی اپنی کچھ حدیں نہیں ہیں؟ تو پھر ہر سوال کے جواب کی توقع صرف سائنس کے علم سے ہی کرنا سراسر نادانی نہیں ہے، کیونکہ سائنس بھی تو صرف ایک علم ہی ہے..... ان ہزاروں دیگر علوم کی طرح جو انسان ازل سے کھوج رہا ہے۔ تو پھر صرف سائنس کے علم کے فارمولے پر ساری کائنات کو پرکھنا کہاں کی عقل مندی ہے.....؟“ میں شاید جذبات کی رو میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور میری آواز بھی معمول سے کچھ بلند ہو گئی تھی لہذا مجھے معذرت کر کے اپنی بات ختم کرنا پڑی۔ لیکن عامر سے رہا نہ گیا۔ ”نہیں..... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہم نے کبھی اس نظریے سے سوچا ہی نہیں..... اور پھر ذہن بھلا کہاں تسلیم کرتا ہے ایسی توجیہات..... جو چیز عقل میں نہ سمائے اور آنکھ بھی اسے دیکھ نہ سکے اس پر یقین ذرا مشکل سے ہی آتا ہے اور پھر تم تو باقاعدہ ایک پوری متوازی دنیا کی بات کر رہے ہو، اسے مضامین کرنا تو ہم جیسوں کے لیے واقعی بڑا مشکل ہے۔“ میں نے ان چاروں کی جانب غور سے دیکھا۔

”ٹھیک ہے تو پھر آپ سائنس سے کہیں کہ روح کی توجیہ بیان کر دے..... ہمارے اندر ایسی کیا چیز پائی جاتی ہے جو نہ ہمیں نظر آتی ہے نہ ہی عقل کی حد سے چھو سکتی ہے لیکن اس کے نکل جانے سے ایک پل میں ہم بے جان مٹی کے پتے کی طرح ڈھسے جاتے ہیں۔ وہ جب تک ہمارے جسم کے اندر رہتی ہے، رگوں میں خون کو رواں رکھتی ہے اور جسم چھوڑ جائے تو ہر عضو اپنے آپ مرجاتا ہے۔ کیوں.....؟ کیا آپ نے اس روح کو کبھی دیکھا ہے.....؟ سائنس سے کہئے کہ وہ روح کو ثابت کر دے، یا پھر اس کی نفی ہی کر دے..... اور روح کی حقیقت تو میں نے بہت بڑی مثال دے دی ہے..... آپ صرف سائنسی طور پر مجھے اس بات کی وضاحت ہی کہیں سے لا دیں کہ ہم مسلمان اگر مردے کو دفناتے وقت زمین سے یہ کہہ دیں کہ یہ جسم امانتاً ورنہ کیا جا رہا ہے تو سالوں بعد بھی اس میت کی منتقلی کے وقت جب زمین کھودی جاتی ہے تو وہ مرا ہوا جسم تازہ کیوں ہوتا ہے.....؟ جب کہ سائنس کے اصولوں کے مطابق تو اس جسم کو گل سڑ جانا چاہئے۔ وہ کون سی چیز ہے جو زمین کو اسے کھانے سے روکتی ہے.....؟ جواب دیں..... یہ تو بہت عام اور روزمرہ کی بات ہے۔“ وہ چاروں لا جواب ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ”میرا مقصد آپ لوگوں کو لا جواب کرنا نہیں ہے، لیکن یہ سب باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس دنیا سے پرے بھی کچھ دنیا میں موجود ہیں۔ ہم ایلینز (Aliens) کے وجود کو تو اژن طشتریوں کے ذریعے ثابت کرتے اور مانتے ہیں لیکن جنات کی ہمارے آس پاس موجودگی سے انکاری رہتے ہیں۔ فون، یا ایس ایم ایس کے ذریعے ایک پل میں دنیا کے دوسرے کونے تک پیغام پہنچانے کے کمال کے تو معترف ہیں، لیکن ایک ماں کے دل سے نکلی ایک پکار پر ہزاروں میل دور بیٹھے اس کے بچے کے دل کی اچانک تیز دھڑکن کے جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ چھوٹی سی ٹی وی اسکرین پر لہروں کے ذریعے پچھنی زندہ تصویروں، یا لائیو ٹیلی کاسٹ پر تو یقین کرتے ہیں لیکن ہند آکھوں اور من کے اندر لگی اسکرین جو دل سے دل کے تار جڑنے پر روشن ہوتی ہے اسے کبھی قابل بھروسہ نہیں سمجھتے۔ ٹیلی بیسی کے ذریعے دوسرے دل کا حال جاننے کو معترف جانتے ہیں لیکن جب کوئی مذہب کے ذریعے حال دل بیان کرنے لگے تو اسے دھکا دیتے ہیں۔ ہاتھ سے نکلتی لہروں اور ریکی کے علاج کے لیے تو گھنٹوں قطار میں بیٹھ کر انتظار کر لیتے ہیں لیکن دوسری جانب اگر کوئی ہاتھ تمام کر اس پر دم کر کے پھونک دے تو ہم شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مرنے پر زندگی ہے ہم اس کی کھوج میں تو دن رات ایک کئے رکھتے ہیں، لیکن ہمارے آس پاس جو بے پناہ زندگی بکھری پڑی ہے اس سے ہمیشہ غافل رہتے ہیں۔ یاد رکھئے، نیل آرمسٹرانگ کے چاند پر جانے

سے پہلے بھی چاند موجود تھا لیکن جب تک سائنس ہمارے شوقِ افر کے عقیدہ کو شک کی نگاہ ہی سے دیکھتی رہی۔ یہ سب باتیں کیا ظاہر کرتی ہیں؟ صرف یہی کہ ہماری متوازی ایک روحانی دنیا بھی ازل سے موجود ہے اور اس دنیا کو جاننے کے لیے بھی ایک سائنس موجود ہے جسے ہم روحانیت کہتے ہیں۔ اس دنیا کی سائنس میں جو کمال حاصل کر لے اسے سائنس دان کہا جاتا ہے اور اس دنیا کا سائنٹسٹ ”صوفی“ کہلاتا ہے۔ جیسے یہاں کی سائنس ظاہری جسم کے درد کو دور کرنے کے لیے ڈسپین، یا دوسرا پین کلر (Painkiller) دیتی ہے ویسے ہی وہاں کی سائنس روح کے درد کے لیے دعا، دم اور ورد کی شکل میں درد کو مارنے کی دوا تجویز کرتی ہے۔ جس طرح ہماری اس ظاہری دنیا کی بیماریاں اور ان کا علاج موجود ہے، اسی طرح اس روحانی دنیا میں بھی ہم بیمار پڑتے ہیں اور ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ رباب بھی ایک ایسی ہی روحانی بیماری کا شکار ہے اور اس کی اس بیماری کا تعلق بھی ہماری متوازی دنیا کی ایک مخلوق کے اثر سے ہے۔ آپ لوگ بھی بس یہی دعا کریں کہ وہ ٹھیک ہو جائے اور اس دنیا کے آخری مرحلے کے کینسر کی طرح اس کی روح کا ناسور لا علاج نہ ہو چکا ہو..... سلطان بابا صرف اس ناسور کو بڑھنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ایسے میں اگر آپ ہی ان کا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر ان کے لیے مشکلات بہت بڑھ جائیں گی.....“ بولتے بولتے میری آواز بیٹھ سی گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا سلطان بابا نہ جانے کب سے میرے عقب میں کھڑے میری یہ ساری تقریریں رہے تھے۔ وہ آگے بڑھے اور پھر اچانک ہی مجھے گلے لگا لیا۔ عامر اور اس کی ٹیم کی آنکھوں سے بھی شک و شبہ کی پرچھائیاں مٹ چکی تھیں اور اس بار جب انہوں نے سلطان بابا سے ہاتھ ملایا تو ان سب کی نگاہیں احترام سے جھکی ہوئی تھیں۔ چلتے چلتے عامر دولہے کے لیے رکا اور مجھ سے بولا ”آج تم نے ہمیں زندگی گزارنے کا ایک ایسا نیا نظریہ دیا ہے جو ہمیشہ سے ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تو تھا لیکن ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔ آج کے بعد میں ہر مریض کو دوا کی پرچی دیتے وقت ایک مشورہ اور بھی دوں گا کہ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے رہنا۔ دوا تو خون کے خلیوں میں جذب ہو کر اپنا کام کرے گی ہی لیکن دعا تمہاری روح کے خلیوں میں جذب ہو کر تمہاری بیماری دور کرے گی۔“ ان کے جانے کے بعد سلطان بابا نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”ساحرمیاں..... لگتا ہے مولوں خضر نے پوری تربیت کے بعد ہی تمہیں میرے سپرد کیا ہے۔ جیتے رہو.....“ میں نے مسکرا کر بات ٹال دی لیکن یہی سچ بھی تھا۔ یہ ساری باتیں جو میں نے آج عامر اور اس کی ٹیم کو قائل کرنے کے لیے کی تھیں ان سب پر میں خود مولوی خضر سے گھنٹوں بحث کر چکا تھا اور انہوں نے ہر بات قرینے سے کی تھی کہ میرے سبب تشدد سوال جواب پاتے گئے۔ رفتہ رفتہ شام بھی ڈھل گئی لیکن میری رگوں میں بھر جانے والی اس آگ کا آج دور دور تک پتا نہیں تھا۔ گویا تو طوفانی الحال اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا تھا۔ اندر زانے سے آنے والی اطلاعات کے مطابق رباب بھی بہت حد تک نارل ہو چکی تھی اور آج ہفتوں بعد اس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیا تھا۔ دیرے دیرے رات ڈھلنے لگی اور وہی اداسی حویلی کی دیواروں اور درزوں سے جھانکنے لگی۔ جو یہاں کا خاصہ تھی۔ سلطان بابا احتیاطاً کٹی بار میرے کمرے میں جھانک چکے تھے لیکن آج میں اپنے جسم پر کسی قسم کا بوجھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میری نظرات بھر بار بار دالان میں اسی شان سے ایستادہ پیپل کے پیز کی جانب اٹھ جاتی تھی اور میرے من میں عجیب و غریب قسم کے سوال آتے رہے۔ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا.....؟..... اس کی دنیا میں انتظار کیسا ہوتا ہوگا اور اس کے انتظار کے لمحے کیسے کٹتے ہوں گے؟ کیا وہ بھی ہم انسانوں کی طرح سجدے میں گر کر اپنے پروردگار سے اس نازنین کی ایک جھلک، ایک لمحے کا ساتھ مانگتا ہوگا؟ اس کی دعا کیسی ہوتی ہوگی۔



اس کے جسم اور اس کی روح پر انتظار کے یہ کرب ناک لمحے کیسی کیفیت پیدا کرتے ہوں گے..... کیا وہ بھی محبوب کی جدائی میں روتا ہوگا..... کیا اس کے آنسو بھی ہم بے بس انسانوں کی طرح صرف نمکین پانی کھلاتے ہوں گے؟ کیا اس کا دل بھی ہوتا ہوگا..... کیا وہ بھی آہیں بھرتا ہوگا.....؟ انہی سوالوں کے جھرمٹ میں صبح ہوگئی فجر کی نماز کے بعد میں خود سلطان بابا کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ بھی شاید رات بھر سو نہیں پائے تھے۔ آج شام ۴۸ گھنٹے پورے ہونے کے بعد رباب کی اور شاید ہماری بھی قسمت کا فیصلہ جو ہونے والا تھا۔ میں نے ان سے یونہی پوچھ لیا۔ ”بابا..... ہم مذہب سے اس طرح مطمئن کیوں نہیں ہو پاتے جس کا ملیت سے سائنس، یا کوئی اور علم ہمیں مطمئن کر جاتا ہے؟“ وہ ہلکے سے مسکائے۔ شاید وہ خود بھی مجھ سے ایسے کسی سوال کی توقع کر رہے تھے۔ ”وہ اس لیے کہ ہم نے صرف کچھ نماز اور روزے کو مذہب کی تکمیل سمجھ لیا ہے۔ جب کہ یہ بنیادی رکن تو صرف مذہب کی ابتدا ہیں..... اصل آغاز مذہب تو اس کے بعد ہے..... اور پھر انتہا کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہاں تک تو شاید کئی پیغمبر بھی پہنچ پائے۔ تو پھر ہم جیسے معمولی انسان بھلا مذہب کی انتہا کو کیا پائیں گے.....؟ جس دن ہم یہ بات سمجھ گئے کہ فی الحال ہم صرف اسلام لائے ہیں..... ایمان لانا ابھی باقی ہے اس روز سارے مسئلے حل ہو جائیں گے..... لیکن شاید ابھی وہ منزل کچھ دور ہے..... بہر حال ہمارا سفر تو جاری ہے اور اسے جاری رہنا چاہئے۔“

اسنے میں حاجی رزاق صاحب نے آکر بتایا کہ رباب کئی مرتبہ عامر کا پوچھ چکی ہے اسے کیا جواب دیا جائے۔ سلطان بابا نے انہیں سمجھایا کہ معاہدے کی رو سے فی الحال عامر کا رباب کے سامنے آنا، یا اس سے ملنا ممکن نہیں ہے۔ مبادا قیامت اسے خلاف ورزی سمجھ کر پھرنی نہ جائے۔ بہتر یہی ہوگا کہ عامر کی غیر موجودگی کا کوئی مناسب بہانہ بنا دیا جائے، کیونکہ اب تو بات صرف چند گھنٹوں کی ہی رہ گئی تھی۔ ایسے میں ہمیں کوئی بھی ایسی خلاف معمول حرکت نہیں کرنی چاہئے جو سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دے۔ حاجی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ان کی بیگم اور چھوٹی بیٹی نایاب بھی بے حد پریشان ہیں اور وہ کسی صورت رباب کو کھونا نہیں چاہتے۔ سلطان بابا نے پھر دینی بات کی کہ وہ سب دعا کریں۔ خدا بہتر کرے گا۔ کچھ بات تو یہ ہے کہ میں خود اندر سے بے حد خوف زدہ اور پریشان تھا اگر قیامت نے سلطان بابا کی شرط مانی تھی اور اپنی محبت کو اس کڑی کسوٹی پر ثابت کرنے کی ہامی بھری تھی تو اس کا دعویٰ بھی کچھ وزن تو رکھتا ہوگا اور پھر میں تو خود اس محبت نامی اژدھے کا نگلا ہوا شکار تھا۔ میری رگوں میں بھی تو یہ بہتا ہوا زہرا سی جذبے کی دین تھا۔ ہاں..... وہی محبت جو انسان پر ابتدا میں تو صبح کی نرم اور لطیف دھوپ کی طرح اترتی ہے لیکن دھیرے دھیرے وہ تپتے صحرا کی اس دو پہر کی شکل اختیار کر لیتی ہے جہاں میلوں دور تک مجھ جیسے بے بس انسانوں کے لیے کوئی نخلستان، کوئی سایہ میسر نہیں ہوتا۔ اس کی روح تک کھلسا دینے والی گرم کرنیں ہمارے نازک بدن کے مسام چیر کر ہمارے اندر پیوست ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے حلق میں کانٹوں کا جنگل اگ جاتا ہے اور دھیرے دھیرے اور قطرہ قطرہ کر کے ہماری جان اسی محبت کے دھکتے سورج تلے نکل جاتی ہے۔ جذبوں اور خواہشوں کی گلابی تتلیاں بے بسی لے ہمیں تڑپاتا اور دم توڑتا ہوا دیکھتی رہتی ہیں اور کچھ ہی دیر میں خود ان کے سنہری پر بھی جل جاتے ہیں۔ ہاں..... ایسی ہی بے دروازہ اور ظالم ہوتی ہے یہ محبت.....

آخر کار وہ پہر بھی آئی گیا جب شرط کے مطابق ہمیں رباب کو اس کے کمرے میں اکیلا چھوڑ آنا تھا۔ حاجی رزاق جب عامر اور بیگم و بیٹی کے ہمراہ کسی بہانے سے نکل کر مہمان خانے کی جانب آ رہے تھے تو ان کی چال سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اس جواری کی چال ہے جو اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیل کر آ رہا ہو۔ ستم یہ تھا کہ بازی تو کھیلی جا چکی تھی لیکن جیت، یا مات کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ باقی گھر والوں کے رنگ بھی اڑے ہوئے

تھے۔ ہم سب دم سادھے مہمان خانے کے شیشے کے برآمدے سے باہر حویلی کے اس حصے کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں رباب کا کمرہ واقع تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری تشویش بے چینی میں بدلنے لگی کیوں کہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ جانے یا قوط کس روپ میں رباب کے سامنے آئے گا اور کس طرح سے اسے اپنی محبت کا یقین دلانے گا؟ اور اگر اس کے دعویٰ کے مطابق رباب بھی اس کی محبت میں اس کی طرح مبتلا تھی تو کیا ہم رباب کو دوبارہ دیکھ بھی پائیں گے، یا نہیں..... اور اگر یا قوط اپنے وعدوں سے پھر گیا تو.....؟ اور اگر کہیں یہ اس کی ہمیں رباب سے چند لمحوں کے لیے دور رکھنے کی سازش ہوئی تو.....؟ ایسے نہ جانے کتنے سوال میرے ذہن میں سوئیاں چمچورہے تھے کہ اچانک اندر سے رباب کی چیخ بلند ہوئی اور ساتھ ہی اس نے چلا کر کہا..... ”عامر.....“ ہم سب بری طرح اچھلے اور میرے ذہن میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ اوہ میرے خدا..... یہ بات میرے، یا سلطان بابا کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئی۔ یا قوط کو ہم نے خود کوئی بھی روپ بدلنے کی اجازت دینے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ عامر کا بہروپ بھی تو بھر سکتا ہے اور اب اگر وہ ایسا کر بھی چکا ہے تو اس نے معاہدے کی کسی بھی طور خلاف ورزی نہیں کیونکہ ہم نے ایسی کوئی پابندی اس پر لگائی ہی نہیں تھی۔ ہم سب رباب کی پہلی چیخ کے بعد جیسے سکتے کے عالم میں کھڑے تھے اور پھر جب چند ہی لمحوں کے بعد رباب کی چیخیں ایک تسلسل اور جنونی انداز میں شروع ہوئیں تو ہم سب ہی اس کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی رباب بے ہوش ہو کر فرش پر گر چکی تھی اور اس کے کمرے میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ سلطان بابا نے فوراً رباب کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چند آیتیں زیر لب پڑھیں اور پانی کے ایک گلاس پر کوئی سورۃ پڑھ کر دم کیا اور رباب کی ماں کو قطرہ قطرہ کر کے وہ پانی رباب کے حلق میں ڈکانے کا کہہ کر ہم سارے مرد کمرے سے نکل آئے۔ وہ ساری رات ہم سب نے رباب سمیت کانٹوں پر گزاری کیوں کہ ہمیں اب بھی اس امتحان کے نتیجے کا پتا نہیں تھا۔ سب کچھ رباب کے ہوش میں آنے کے بعد ہی واضح ہونا تھا اور رباب نے ہوش میں آنے کے لیے پورے چودہ گھنٹے لئے۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ دیر تک وہ ہم سب کو اجنبی اور پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر روتے ہوئے اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ سلطان بابا نے اسے تسلی دی کہ اب ہم سب اس کی حفاظت کے لیے وہاں موجود ہیں لہذا وہ اطمینان رکھے اور ہمیں گزشتہ رات کا پورا واقعہ سنائے۔ بڑی مشکل سے رباب نے اپنے حواس یک جا کئے اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں وہ ہمیں صرف اتنا بتا پائی کہ کل رات کو وہ کافی دیر تک عامر کا موبائل نمبر ملانے کی کوشش کرتی رہی لیکن فون بند پا کر اس نے جھنجھلاہٹ میں عامر کو SMS کر دیا کہ اگر اس نے فوراً ہی رباب سے رابطہ نہ کیا تو وہ عمر بھر اس سے بات نہیں کرے گی۔ اسی اثناء میں باہر آہٹ ہوئی تو رباب نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے؟ تبھی اسے عامر کی جھلک دکھائی دی۔ جو شاید اسے ستانے کی خاطر چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رباب لپک کر اس کے قریب پہنچی تو عامر نے اسے اس اندھیرے کونے کا بلب جلا کر روشنی کرنے سے منع کر دیا کہ گھر والے چونک جائیں گے اور خود اس نے رباب کا ہاتھ تھام لیا۔ رباب کے بقول اس وقت عامر کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور خلاف معمول عامر نے اسے ایک بار اترار محبت کی تجدید پھر سے اپنے لفظوں میں کرنے کا کہا۔ رباب الجھ ہی گئی کیوں کہ اس نے آج تک عامر کا ایسا برتاؤ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو گھر میں گھستے ہی آسمان سر پر اٹھالینے کا قائل تھا اور محبت کی تجدید تو دور وہ رباب کی اس کے اس ”کتابی عشق“ پر اس قدر ٹوکتا اور تنگ کرتا تھا کہ کبھی کبھار تو رباب تھک کر رو پڑتی تھی اور عامر کو اس طرح کے اظہار محبت سے تو سدا کی چیز تھی۔ وہ نایاب کو اپنے ساتھ ملا کر رباب کی ایسی نقلیں اتارتا کہ رباب پھر ہفتوں اس سے بات نہیں کرتی تھی اور آج وہی عامر جب اس تاریک گوشے میں رباب کے ہونٹوں سے محبت کے دو لفظ ادا ہو جانے کے انتظار میں اپنا سب کچھ



لنا دینے کا دعویٰ کر رہا تھا تو رباب کا چو کنال لازمی تھا اور پھر عامر کے پر فیوم کی خوشبو بھی تو خلاف معمول کچھ عجیب سی تھی اور اس کی وہ گرم سانسیں جو رباب کا رُود آں جلانے کا باعث بن رہی تھی۔ رباب نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ وہ تو سدا سے اس کی محبت میں پاگل ہے۔ لیکن عامر نے جب رباب سے تیسری مرتبہ یہ بات پوچھی کہ کیا اسے واقعی عامر سے محبت ہے اور کہیں وہ دوسروں کے سامنے اس بات سے مکر تو نہیں جائے گی تب رباب کا کاٹھا ٹھنکا اور اسے پہلی بار یہ ہڈیوں کے گودے کو جمادینے والا سرد احساس ہوا کہ اس کے پاس کھڑا یہ شخص عامر نہیں کوئی اور ہے اور جیسے ہی اس کے حلق سے پہلی چیخ بلند ہوئی تب کسی نے جیسے اس کے تمام حواس یک بار ہی بیدار کر دیے۔ وہ جان چکی تھی کہ اجنبی ہاتھوں کا یہ لمس اور مہکتے وجود کی یہ خوشبو کسی نا محرم ہستی کی ہے۔ بس پھر کیا تھا رباب کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش کھو بیٹھی اور شاید یہ وہی لمحہ تھا جب ہم سب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ یا قوط شرط ہار چکا تھا۔ رباب اس کی انجان محبت کو شناخت نہیں کر پائی اور شاید یہ پہلی محبت کی بار تھی جس پر وہاں موجود ہر شخص خوش تھا۔ لیکن شاید وہاں کوئی اور بھی تھا جو اپنی محبت کے یوں سر بازار لٹ جانے پر ماتم کنساں تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کھڑے پیپل کے پیڑ پر نظر ڈالی۔ باہر ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور پیڑ کے پتوں سے پانی کی بوندیں آنسو بن کر ٹپک رہی تھی۔ قدرت نے جب ہم خود غرض انسانوں کو کسی کی محبت کی ہار کا جشن مناتے ہوئے دیکھا تو شاید اس سے رہانہ گیا اور اس نے اس ہار کے غم میں خود آنسو بہانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تجھی یہ برستی بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمارے لیے اجنبی تھا۔ دوسری دنیا کا تھا لیکن قدرت کا تو اپنا تھا..... اتنا ہی اپنا، جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی قریب جتنی قربت کا دعویٰ ہماری یہ انسانی مخلوق کرتی ہے۔

اگلے دو روز حاجی رزاق اور گھر والے اسی فکر میں گھلتے رہے کہ کہیں وہ واپس نہ آ جائے لیکن سلطان بابا نے انہیں اطمینان دلایا کہ یہ ایک انسان کا وعدہ نہیں کہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے۔ اب وہ عمر بھر اپنے عہد کی پاسداری میں رباب کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ اسی لمحے نہ جانے مجھے ایک عجیب سا احساس کیوں ہوا۔ سلطان بابا نے بات کرتے وقت غیر ارادی طور پر دوسرے پیپل کے پیڑ کی جانب نظر ڈالی اور مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا نے اس سیاہ نصیب کو کم از کم اس پیڑ پر بیرے کی اجازت دے دی ہے، لیکن گھر والوں کے اطمینان کے لیے وہ اس راز کو افشا نہیں کرنا چاہتے۔ آخر کار ہمارے رخصت ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ حاجی رزاق کے تمام گھر والوں کی آنکھیں اس پلِ غم تھیں۔ سلطان بابا نے خاص طور پر رباب اور عامر کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں دعا دی۔ ٹھیک اسی لمحے میں پیپل کے پیڑ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ”کیا ہوا؟“ میں خاموش رہا اور پھر دھیرے سے ان کے کان میں کہہ ہی ڈالا۔ ”ایک دل جلتے کو آخری سلامی پیش کر رہا تھا۔“ ان کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لہرا کر غائب ہو گیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ حاجی رزاق کے خاندان کو ہم آخری سلام کر کے باہر نکلنے لگے تو ایک لمحے کو رکے اور مجھے سامنے کھڑا کر کے بولے۔ ”ساحر میاں..... آج سے تمہارا ساحر سے عبداللہ تک کا سفر ختم ہوا۔ تم ہر امتحان پر پورے اترے ہو اور مجھے یقین ہے کہ اب چاہے تم کہیں بھی رہو، تمہارا اس متوازی دنیا کا یہ سفر جاری رہے گا اور اب تم اپنی دنیا خود کھوج سکتے ہو..... جاؤ..... گھر لوٹ جاؤ۔ زہرا تمہارا انتظار کرتی ہوگی..... مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں..... بڑا لمبا سفر طے کرنا ہے..... میرے ساتھ کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکے ہو..... اب میرا فرض ہے کہ میں تمہارا حق ادا کر دوں..... خوش رہو ہمیشہ“ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ میں ان کی بات سن کر تڑپ ہی تو گیا۔ ”کیا آپ مجھ سے اکتا گئے ہیں.....؟ کیوں دور کرنا چاہتے ہیں مجھ کو خود سے؟ زہرا نے کہا تھا کہ وہ قیامت تک ہماری روحوں کے ملاپ کا انتظار کرے گی، لیکن

آپ آج ابھی سے مجھ پر یہ قیامت کیوں ڈھانا چاہتے ہیں.....؟ ہاں البتہ آپ کے اگلے سفر میں میں آپ پر بوجھ بن رہا ہوں، یا میری وجہ سے آپ کی راہ کھوٹی ہو رہی ہے تو پھر جیسے آپ کا حکم.....؟؟ انہوں نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ”تم ہرگز مجھ پر بوجھ نہیں ہو..... تم تو وہ ہم سفر ہو جس کی تمنا کوئی بھی راہی کر سکتا ہے.....“ وہ کچھ دیر کے لیے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے پھر انہوں نے جیسے کوئی حتمی فیصلہ کر کے سر اٹھایا۔ ”ٹھیک ہے..... تم یہ سفر جاری رکھنا چاہتے ہو تو پھر یونہی سہی..... لیکن یہاں سے ہماری راہیں عارضی طور پر جدا ہوتی ہیں۔ ہم دونوں یہاں سے ریلوے اسٹیشن سے مشرق اور مغرب کی طرف جانے والی الگ الگ گاڑیوں میں روانہ ہوں گے۔ تمہاری گاڑی جو مغرب کی طرف جائے گی وہ تمہیں جبل پور کے اسٹیشن تک پہنچائے گی اور میں مشرق کی راہ لوں گا۔ لیکن دھیان رہے جبل پور کی درگاہ بذات خود ایک بہت بڑا امتحان ہے اور اب تمہیں تنہا ہی اس امتحان سے گزرنا ہو گا۔ تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔“ میں نے سر جھکا دیا۔ ”آپ مجھے ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔“ انہوں نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ حویلی کے بڑے پھانک سے نکلتے وقت نہ جانے میری نظر خود بخود پلٹ کر اس پتیل کے پیڑ کی جانب کیوں اٹھ گئی جو اپنی شاخیں کسی ماتم زدہ بیوہ کے انداز میں کھولے، کھڑا ہوا نہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سو گوار پیڑ کسی سے یہ کہہ رہا ہو.....

ابھی کچھ دیر باقی ہے

خزاں کے بیت جانے میں

گلوں کے مسکرانے میں

خوشی کے گیت گانے میں

بہاروں کے زمانے میں

ابھی کچھ دیر باقی ہے.....

نہ تم کو یاد آؤں گا

میں تم سے دور رہ کر بھی

تمہیں جی کر دکھاؤں گا

تمہیں معلوم ہے لیکن

یہ سب میں کرنے پاؤں گا

کہ تم کو بھول جانے میں

ابھی کچھ دیر باقی ہے.....

ابھی..... کچھ دیر باقی ہے



اسلام کے ایک تمام مجاہد کی ایمان افروز حرکت

دو جلدوں میں مکمل

طاہر جاوید مغل

قیمت فی جلد 400 روپے

بہترین کیپوٹنگ خواہ صورت جلد اور عموماً طاعت کے ساتھ

عالمی دھماکا کمیشن

۲۰ عزیز کورٹ، اردو بازار لاہور 7247414

نہایت ریزی، چوک میوہ پتال، لاہور

عالمی بکسٹال



## دامن اور چگاری

کہتے ہیں ”زندگی میں کتنے پل ملے.....“ یہ سوچ کر جینے سے بہتر ہے کہ ”ہر پل میں کتنی زندگی ملی.....“ اس بات کو جینے کا پیمانہ بنایا جائے۔ لیکن سلطان بابا سے جدا ہونے کے بعد جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے حصے کے پل اپنی زندگی گنوا بیٹھے ہیں۔ ٹرین کو اسٹیشن چھوڑے اب گھنٹہ بھر سے زائد ہو چکا تھا لیکن میرا ذہن ابھی تک وہیں اسٹیشن پر سلطان بابا سے ہوئے الوداع میں اٹکا ہوا تھا۔ جانے میری منزل کہاں تھی؟ سلطان بابا نے تو صرف جبل پورا اسٹیشن کا ٹکٹ میرے حوالے کر کے مجھے اس ٹرین پر چڑھا دیا تھا لیکن جبل پور نامی قصبے میں مجھے کہاں جانا تھا؟ کس سے ملنا تھا.....؟ یہ سارے سوال میرے سامنے منہ کھولے کھڑے تھے۔ لیکن اب تک تو مجھے ان حالات کا عادی ہو جانا چاہئے تھا..... میں کیوں بار بار ان بے معنی سوالوں میں خود کو الجھا لیتا تھا۔ میری گھر سے نکلنے اور درگاہ سے یہاں اس ٹرین کا اکاٹوی کا اس کے ڈبے تک کے سفر میں جانے ایسے کتنے الجھے سوال میری زندگی میں آکر اپنا حل پا چکے تھے۔ ایک سوال اور سہی..... میں نے تھک کر اپنی آنکھیں موندھنے کی کوشش کی اور اپنا سر ادھڑی ہوئی سخت نشست کی ٹیک پر ٹکانے کی کوشش کی لیکن ٹرین کے جھلکے بھلا میرا توازن کہاں برقرار رہنے دیتے.....؟ ٹنگ آ کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک ماں اپنے بچے کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ٹرین کی گز گڑا ہٹ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں..... یہ تو سارے ڈبے مل کر اللہ ہو..... اللہ ہو کا ورد کر رہے ہیں۔ ماں نے بچے کے دل سے ڈر نکالنے کے لیے خود ہی ٹرین کے دوڑنے کی آواز اور ڈبوں کے آپس میں ٹکرائے اور ٹھکا ٹھک جیسی آواز کو ایک سر میں ڈھال کر اسے اللہ ہو کی شکل دے دی اور اپنے بچے کو تھکنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا بچہ بھی اس گز گڑا ہٹ کی آواز کے ساتھ اللہ ہو کا ورد کرنے لگا۔ دوسری جانب کچھ تبلیغی حضرات بیٹھے اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ عصر کی نماز ٹرین میں ہی ادا کر لی جائے، یا پھر کسی چھوٹے اسٹیشن پر دو چار منٹ کا وقفہ لے کر باقاعدہ جماعت کروالی جائے۔ ان سے ذرا پرے ایک ادھیڑ عمر کے مولانا اپنی بیوی کو بار بار اپنے برقعے کا نقاب ٹھیک طرح سے گرانے کی تلقین کئے جا رہے تھے۔ ان کی بیگم کا شاید اتنے بھاری نقاب کے اندر دم گھٹ رہا تھا اور اسی لیے وہ ہر پانچ سات منٹ کے وقفے کے بعد اپنا نقاب ذرا الٹ دیتی تھیں اور جلدی جلدی چار چھ لمبی سانسیں لے کر اپنا دم بحال کرنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن جمعی مولانا صاحب کی خشمگیں نگاہیں اور ان کا دیرے مگر کڑے تیوروں کے ساتھ ”زلیخا“ بولنا ہی ان کی بیگم کے لیے کافی ہوتا اور وہ بے چاری جلدی سے اپنا نقاب دوبارہ گرا دیتی تھیں۔ دراصل مولانا صاحب کا بھی قصور نہیں تھا۔ سامنے ہی یوگی میں دو نشستیں چھوڑ کر کالج کے تین لالہ بالی سے لڑکوں کا ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا جو ذرا ذرا سی دیر میں ریڈیو پر بجاتے کسی گیت کی تال میں تال ملا کر اپنا اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتے تھے اور ایسے میں ان تینوں کی نظر زیادہ تر اگلے حصے میں بیٹھی ان دو نازک سی لڑکیوں پر ہوتی تھی جو اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کے ساتھ شاید کسی تقریب میں شرکت کے لیے اپنے گھر سے نکلی تھیں۔ لڑکیاں شوخ تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر کھل کر ہنس رہی تھیں اور اپنی ماں سے کسی بات پر بحث

میں مصروف تھیں۔ جب کہ لڑکیوں کے ماں باپ شادی پر دی جانے والی سلامی اور خرچے کے رونے رو رہے تھے۔ کالج کے لڑکے گاہے بگاہے پاس سے گزرنے والے پھیری والوں سے کبھی گرم بھنے ہوئے نمکین پتے، کبھی گزک تو کبھی لمکا اور فالسے کی بوتلیں خرید خرید کر لڑکیوں کے بھائی کو بھی اس دعوت عام میں شریک کر لیتے تھے اور ان کی زیادہ تر خواہش یہی ہوتی تھی کہ یہ غیو اور مرج لگا بھٹا، گرم مونگ پھلیاں اور نرم ریوڑیاں بھائی سمیت اس کی دونوں بہنوں تک بھی ترسیل ہوتی رہیں۔ مولانا صاحب دل پر پتھر رکھے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے اور بار بار زیر لب ”لا حول ولا قوۃ“ کا ورد بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان سے دو نشست پیچھے دو صاحبان بڑی شد و مد سے ایک دوسرے کے پتے اور ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے میں مصروف تھے، حالانکہ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اگلے اسٹیشن پر اترتے ہی وہ یوں اپنی اپنی راہ لیں گے کہ پھر کبھی پلٹ کر بھی ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھیں گے۔ لیکن بہر حال، وقت تو کسی طور کاٹا ہی تھا۔ مجھ سے پچھلی نشستوں پر سگریٹ اور بیڑی کے دھوئیں کے بادل تیز رہے تھے اور ان نیلگوں ماحول میں چار حضرات بیٹھے تاش کھیلنے میں یوں مگن تھے جیسے انہیں زندگی میں اس ٹرین سے اترنے کے بعد دوبارہ کبھی تاش کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ اب تک جانے کتنی بازیاں کھیل چکے تھے لیکن کسی پر بھی بازی جیتنے کی خوشی، یاد او بار جانے کے دکھ کے آثار نمایاں نظر نہیں آرہے تھے۔ ہر بازی کے اختتام پر چند نعرے بلند ہوتے اور پھر سے وہ چاروں نئی بازی کے پھیرے میں الجھ جاتے، جانے یہ کیسی سعی لا حاصل تھی.....؟

اچانک ٹرین کی رفتار کم پڑنے لگی۔ اوپر تھ پر لینے ہوئے ایک حضرت نے جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اپنے چہرے پر ڈلی ہوئی چادر ہٹا کر درجنوں بار تفتیشی انداز میں دولت پور کے اسٹیشن کا پوچھ چکے تھے انہوں نے ایک بار پھر جلدی سے چادر ہٹائی اور وہیں سے آواز لگائی۔ ”کیوں میاں..... دولت پور کا اسٹیشن تو نہیں آ گیا۔“ اور پھر حسب معمول کسی کا جواب نہ پا کر دوبارہ اپنے چہرے پر اپنا کھس پھیلا کر خراٹے لینے لگ گئے۔ ٹرین نے چند زوروں پر جھٹکے لیے اور پھر ایک لمبی سی اسکرینج کی آواز کے ساتھ آخری ٹنگی لے کر رک گئی۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا جس کے پلیٹ فارم کے سروں پر جڑے تختوں پر لکھا نام تک ماہ و سال کی گردش کی تاب نہ لاتے ہوئے مٹ چکا تھا۔ تاش کی بازی والوں میں سے کوئی ایک چلایا۔ ”چل بے سلو..... اسٹیشن آ گیا۔ اب شرط کے مطابق بھاگ کر گرم گرم پکڑے اور چٹنی پکڑ لا..... اور دیکھ پکڑوں پر چاٹ مصالحہ ڈالو تا نہ بھول جائیو.....“ سلو نے حکم کی تعمیل میں فوراً پلیٹ فارم پر چپ لگائی اور پکڑے والے کے ٹھیلے کی جانب دوڑ لگا دی۔ مولانا کی بیگم نے بھی شاید گرم پکڑوں کے تذکرے کو سن کر اپنے میاں کے کان میں کچھ کھسر پھسری۔ مولانا بادل خواستہ کراہتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ڈبے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر اپنی بیگم کو نقاب تانے رکھنے کی ہدایت کی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے نہ جانے انہیں کیا ہوا کہ دھیرے سے کھکا کر رکے اور آہستہ سے بولے ”میاں..... میں ذرا نیچے سے کچھ سامان پکڑ لاؤں آپ زنانے کا دھیان رکھئے گا۔“ میں نے چونک کر حیرت سے ان کی جانب دیکھا لیکن وہ آگے بڑھ چکے تھے۔ پورے ڈبے میں انہیں میں ہی قابل اعتبار کیوں دکھائی دیا.....؟ پھر خود ہی میری توجہ اپنے حلیے کی جانب چلی گئی۔ اوہ..... تو ایک بار پھر میرا یہ ظاہری حلیہ ہی میرا تعارف ثابت ہوا تھا۔ جانے ہم انسانوں نے کسی کی ظاہری وضع قطع کو ہی شرافت و نجابت کا معیار کیوں سمجھ رکھا ہے؟ یا پھر شاید ہم ظاہر پرستوں کے پاس اس وقتی پیمانے کی علاوہ اور کوئی چارہ ہو بھی نہیں سکتا تھا.....؟ تبھی تو وہ مولانا اپنی پوری ”زلیخا“ میرے حوالے کر کے اطمینان سے پلیٹ فارم پر اتر چکے تھے۔ لیکن ان کی سیدھی سادی بیگم نے شوہر کے اٹھتے ہی اپنا نقاب کچھ اس طرح سے کس کر لپیٹا اور



یوں سکڑ سٹ کر بیٹھ گئیں کہ چاہے کبھی کسی کی نظر ان کی جانب اٹھ نہیں سکتی تھی۔ جانے کیوں مجھے اس وقت بہت شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ پردہ ہی عورت کی سب سے بڑی ڈھال ہے اور مرد کی غیر موجودگی میں یہ پردہ ہی عورت کا سب سے بڑا تعارف بھی بن جاتا ہے۔ مولانا کی بیگم کو جب تک میاں کی ڈھال میسر تھی وہ گاہے بگاہے خود کو بے نقاب بھی کر لیتی تھیں لیکن جیسے ہی ان کی یہ آڑھ چند لمحوں کے لیے ان سے کچھ دور ہوئی تو فوراً انہوں نے اپنی ڈھال یعنی اپنے پردے کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنالیا۔ مجھے اس پل ایک اور انجانا اور بہت عجیب سا ادراک بھی ہوا کہ مرد کی نظر اور عورت کی حیا میں دامن اور چنگاری کا تعلق ہے۔ مرد کی نظر چنگاری ہے تو عورت کی حیا ایک نازک دامن ہے۔ کبھی چنگاری دامن کی طرف لپکتی ہے تو کبھی دامن اس چنگاری کو ہوادے کر بھڑکا دیتا ہے اور نتیجہ دونوں صورتوں میں صرف اور صرف آگ بن کر ہی وارد ہوتا ہے۔ یہ دامن اور چنگاری کا کھیل ازل سے جاری ہے اور اب تک جاری رہے گا۔

ٹرین کو اس اسٹیشن پر رکے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ ہوئے تو کچھ لوگ معلومات کے لیے پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ پتا چلا کہ چند لمحوں میں ہی کوئی کراسنگ ہونے والی ہے لہذا اسٹپل ملنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ تبلیغی جماعت کے حضرات کو بھی موقع مل گیا کہ تب تک جلدی سے جماعت ہی کروا لی جائے۔ نیچے اترتے اترے ان میں سے کسی صاحب نے مجھے بھی دعوت دی اور میں بھی ان کے ساتھ ہی نیچے پلیٹ فارم پر اتر آیا لیکن جماعت کھڑی ہونے سے پہلے ایک عجیب سی صورت حال آن کھڑی ہوئی۔ جن صاحب نے امامت کروائی تھی وہ اچانک پلٹے اور ان کی نظر مجھ پر پڑی اور مجھ سے بولے۔ "حضرت..... آئیے آپ جماعت کی امامت کیجئے....." کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا لیکن جب انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے آگے کھڑا کرنا چاہا تب میں بالکل ہی بوکھلا گیا اور میں نے بڑی مشکل سے پوری جماعت کو یقین دلایا کہ میں اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتا خود کو..... لیکن سبھی نمازیوں نے امام صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی تھی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ جناب ابھی تو میری زبان تکبیر تک دیتے ہوئے لڑکھڑاسی جاتی ہے تو پھر بھلا میں کہاں اور امامت کہاں؟ درگاہ کی مسجد میں بھی مولوی خضر کے شدید اصرار کے باوجود میں صف میں بالکل ان کے پیچھے نہیں کھڑا ہوتا تھا تا کہ مجھے تکبیر نہ کہنی پڑے۔ پتا نہیں میں خود کو اپنے اس داغ دار دامن کے ساتھ ان اعزازات اور ان رتبوں کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے پلیٹ فارم پر صورت حال کو ان سب نمازیوں پر واضح کیا اور جماعت کے لیے انہی صاحب کو راضی کیا جو اصل پیش امام تھے جماعت ختم ہونے سے پہلے ٹرین دوبار سیٹی بجا چکی تھی، لہذا ہم سب سلام پھیر کر جلدی جلدی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے اور اگلے لمحے ہی ٹرین نے کسی بوڑھے کے غرارے کرنے جیسی آواز کے ساتھ دو چار جھٹکے لیے اور پھر دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئی۔ نوجوان طالب علموں کا گروپ اب اپنی جگہ تبدیل کر کے میرے بالکل سامنے والی نشست اور میرے مقابل اپنی جگہ سنبھال چکا تھا جس کی وجہ شاید وہ یہی جوڑا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی نہ جانے کس دوسری بوگی سے ہمارے ڈبے میں آ کر بیٹھا تھا۔ مرد کی بھوری مونچھیں حد سے زیادہ پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر ہفتے بھر سے زیادہ کی شیو کے ساتھ تھکن کے آثار بھی نمایاں تھے جب کہ لڑکی کے بال سنہرے تھے جسے اس نے دو چوٹیوں کی صورت میں اپنے دھول سے اٹے لیکن گلابی چہرے پر شانوں کی ست جھلا رکھا تھا۔ لڑکوں کی ساری توجہ اسی میم کی جانب تھی اور وہ سب ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس بچی جوڑے کا حدود اور بعد معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور انہیں اپنے مکمل "تعاون" کا یقین دل رہے تھے۔ جب کہ بوگی کے تمام بزرگ

انہیں اس حرکت پر گھور گھور کر باز رہنے کی تلقین میں کوشاں تھے۔ لڑکوں نے مجھے دیکھا تو بوگی کے لوگوں کا دھیان بٹانے کے لیے ان میں سے ایک نے بات جوڑی۔

”سلام مولانا جی..... میرا ایک سوال ہے آپ سے..... دراصل مجھے دعائے قنوت پوری یاد نہیں ہوتی..... تو کیا میں عشاء کی نماز کے وتروں میں دعائے قنوت کی جگہ تین بار قل ہو اللہ پڑھ لیا کروں.....؟ لڑکے کے سوال کے خاتمے تک اس کے باقی ساتھیوں کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف وقت گزاری اور لوگوں کی نظر کی برچیوں کو ٹالنے کے لیے یہ موضوع چھیڑ رہے تھے تاکہ انہیں اس گوری میم کے قریب بیٹھے کا مزید کچھ وقت اور موقع مل سکے۔ میرے ہونٹوں پر بھی اس کا سوال سن کر مسکان آ گئی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں..... میں تو خود ابھی تک تین بار قل ہو اللہ سے ہی کام چلا رہا ہوں۔“ میری بات سن کر آس پاس بیٹھے کچھ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ سارے لڑکے بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ان میں سے ایک نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ارے یار تم تو بالکل ہم جیسے ہو۔ پھر اتنی دیر سے یوں سنجیدہ ہی صورت بنا کر کیوں بیٹھے ہوئے ہو.....؟“ چند لمحوں میں وہ تینوں مجھ سے یوں گل مل چکے تھے کہ جیسے میں بھی ان کا کالج فلویہ یا ہم جماعت ہوں۔ حتیٰ کہ کچھ ہی دیر میں ان میں سے ایک نے مجھ سے یہ سوال بھی کر ڈالا کہ ”حافظ جی! آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میں جو آج ان کے ساتھ اس ٹرین میں بیٹھا ہوا یہ سفر کر رہا تھا، یہ راستے منزلیں..... میرا کبھی کچھ اس ایک محبت کی دین ہی تو تھا۔ جتنا نہیں ہم محبت جیسے جذبے کو بھی حلیے کی بنیاد پر کیوں پرکھتے تھے۔ کیا شرعی لباس پہننے سے، یا چہرے پر چند ہفتوں کی داڑھی بڑھ آنے سے انسان ان لازوال روحانی جذبوں کا حق رکھنے سے بھی محروم ہو جاتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ فی الحال تو میں محبت کی کھوج میں ہوں..... ہاں البتہ اگر کبھی اس کھوج میں مجھے کامیابی ہوئی تو اسے ضرور مطلع کر دوں گا۔ کبھی لڑکے چلائے کہ ”مولانا آپ ہمیں اپنی شادی میں ضرور مدعو کیجئے گا۔“ کبھی بوگی والے ہنس پڑے۔ اچانک ہی مجھے بہت ٹوٹ کر زہرا کی یاد آئی۔ کیا ہم کبھی واقعی مل پائیں گے؟ کیا یہ دنیاوی ملن جسے لوگ یہاں شادی کے بندھن کا نام دیتے ہیں، کیا یہی بندھن ہی صرف ایسی زمینی محبتوں کی معراج ہوتا ہے؟ کیا صرف ایک رسم کے ادا ہو جانے سے اور ایک بندھن میں بندھ جانے سے ہماری محبت کی تکمیل ہو جاتی ہے؟ پر مجھے تو جانے کیوں یہ جسامتی ملاپ ہمیشہ سے ہی اُس گلابی اور اُن چھوئے احساس کی فنا جیسا لگتا تھا جسے ہم صرف دل سے دل اور روح سے روح کا ملاپ، یا محبت کہتے ہیں۔ مجھے ہر بار یہی محسوس ہوا کہ جیسے ہم اس بندھن کے سودے میں کچھ نہ کچھ کھو ضرور دیتے ہیں۔ لا حاصل کی کسک اور دسترس سے دوری کی تڑپ کا بھی تو اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے جس کا خمار ملکیت مل جانے کا احساس مٹا دیتا ہے۔ تمہی کچھ لوگ جس لمحے اس بندھ کی گاتھ باندھ رہے ہوتے ہیں ٹھیک اسی پل وہ اپنے رومان کے اصول سنہری جال کی گرہیں سدا کے لیے کھول بیٹھتے ہیں۔ انہیں اپنی محبت کا جسم تو مل جاتا ہے لیکن وہ اپنے رومان کی روح کو ہمیشہ کے لیے کھودیتے ہیں۔

میں جانے کتنی دیر عشق اور رومان کی یہ الجھی گتھیاں سلجھا تا رہا۔ گاڑی کافی دیر سے کمال آباد نامی شہر کے جکشن پر کھڑی تھی۔ اچانک میری نظر باہر پلیٹ فارم پر پڑی اور کچھ دیر کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ اب میں واقعی جاگتی آنکھوں سے بھی پسند دیکھنے لگا ہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے زہرا کو کسی درمیانی عمر کی عورت کے ساتھ پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہو۔ ہاں..... بالکل..... وہ زہرا ہی تو تھی لیکن نقاب کے بغیر اور عورت بھی



میرے لیے انجانی تھی، لیکن زہرا.....؟ یہاں.....؟ کمال آباد کے اس ریلوے پلیٹ فارم پر؟ اگلے ہی لمحے میں لپک کر اٹھا اور تقریباً دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا اور یہاں بھینڑ بھاڑ بھی کافی تھی لیکن ابھی تک میں دور جاتی اس عورت کی سفید بڑی سی چادر دیکھ سکتا تھا جسے میں نے زہرا کی اس شبیہ کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جب تک میں پلیٹ فارم کے خارجی دروازے تک پہنچا تب تک وہ اسٹیشن سے نکلتی بھینڑ میں گم ہو چکی تھیں۔ میں نے لپک کر باہر دیکھا لیکن سڑک پر تانگوں، سائیکل رکشوں اور موٹر گاڑیوں کے اس جھوم میں مجھے ان دونوں کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی۔ اتنے میں گاڑی نے تیسری سیٹی بھی بجا دی اور جب تک میں بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک پہنچا، ٹرین تقریباً پلیٹ فارم چھوڑ چکی تھی۔

اپنی نشست پر بیٹھ کر کبھی میں کافی دیر تک اس اوہیڑ بن میں ہی الجھا رہا۔ کیا یہ میری نظر کا دھوکا تو نہیں تھا۔ زہرا اتنی بھینڑ میں، بے انتخاب کیسے گھوم سکتی ہے؟ اور پھر وہ اجنبی عورت اس کے ساتھ کون تھی؟ لیکن روپ تو بالکل زہرا کا ہی تھا، وہی خیرہ کن اور مبہوت کر دینے والی شبیہ..... مگر وہ یہاں اس دور دراز شہر میں کس غرض سے آ سکتی ہے؟ ایک بار تو جی میں آیا کہ میں کمال آباد کے مضافات سے گزرتی ٹرین کی زنجیر کھینچ کر اتر جاؤں اور واپس شہر جا کر اسے تلاش کروں لیکن کہاں.....؟ میرے لیے تو وہ شہر بھی اتنا ہی اجنبی تھا جتنا کہ خود میرا یہ وجود ٹھیک اس لمحے میرے اپنے لیے ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی ہم ایک لخت اپنے آپ ہی سے بیگانے اور اجنبی بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا وجود اور اپنی ہر کھوج اور کوشش بے معنی اور لا حاصل سی لگنے لگتی ہے۔

میں بھی ناامیدی اور مایوسی کے ایسے ہی گردابوں میں پھنسا ہوا تھا کہ ان لڑکوں کی منزل آگئی اور مغرب سے پانچ منٹ پہلے ایک درمیانے درجے کے اسٹیشن پر وہ تینوں مجھ سے گلے مل کر اتر گئے۔ اترنے سے پہلے ان میں سے ایک نے شاید اپنا پتا، یا ٹیلی فون نمبر لکھ کر ان دو بہنوں میں سے ایک کی جانب اچھالا لیکن چائے والے لڑکے کے درمیان میں آ جانے کی وجہ سے وہ درمیان میں ہی کہیں گر گیا۔ تب تک لڑکیوں کے باپ کی توجہ ان کی جانب ہو چکی تھی لہذا وہ مایوسی کے عالم میں مجھ سے گلے ملتے ہوئے دھیرے سے میرے کان میں بولا ”اپنی قسمت خراب ہے حافظ جی..... ہو سکے تو اترنے سے پہلے بڑی والی کو ارشد کا سلام کہئے گا۔ اس کا نام ناہید بتایا ہے اس کے بھائی نے.....“ فوراً ہی ٹرین نے جھٹکا لیا اور اسٹیشن ہماری نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ تینوں میری جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے مغرب کے وقت کے اندھیرے کا حصہ بنتے گئے۔ حسب معمول مغرب کے وقت کے عجب سے اثر نے میرے ارد گرد ادا اسی کے سائے لیے کر دیئے۔ میں نہ جانے کیوں اس زوال کے وقت اس قدر نڈھال سا ہو جاتا تھا۔ سارے دن کی تنہائی ایک ہی لمحے میں میرے اندر دبیرا کر لیتی تھی۔ اچانک ہی میرے ارد گرد چیمبل کے تیل جیسی عجیب سے خوشبو بکھر گئی۔ میں نے چونک کر سامنے والی برتھ پر نظر ڈالی تو ایک چھوٹے قد کا مخمخ سا شخص جس کے بال شاید اس تیل میں چڑے ہوئے تھے اور چھچھ کی جانب چپکا کر بنائے گئے تھے، اپنی چھوٹی چھوٹی، لیکن نیزے کی نوک جیسی چھتی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ مجھے اس کی آمد اور برتھ پر چڑھنے کی بالکل بھی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شاید وہ اس وقت برتھ پر آ چڑھا ہو جب میں چلتی ٹرین میں ہی بیٹھے بیٹھے مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ مجھے اس کی چھتی نظروں سے الجھن سی ہونے لگ گئی تھی۔ جانے یہ جبل پور کا اسٹیشن کب آئے گا۔ اس نے شاید میرے اندر کی بے چینی بھانپ لی اور وہیں سے بولا ”کہاں جانا ہے.....؟“ میں سٹ پٹا سا گیا۔ ”جی..... جبل پور.....“ ”ہونہ..... جبل پور میں کس کے پاس جاؤ گے.....؟“ مجھے بھی وہیں اترنا ہے.....“ میں نے بات بنائی ”وہ مجھے لینے خود ہی اسٹیشن پر آ جائیں گے.....“ اب میں اسے کیا بتانا کہ خود مجھے ابھی تک پتا نہیں تھا کہ مجھے

جبل پور میں کس کے پاس جانا ہے۔ میں تو سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اس ٹرین میں آ بیٹھا تھا اور مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ مجھے جبل پور کے اسٹیشن پر اتر جانا ہے۔ لیکن شاید اس کی تصفیٰ نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی لگا تار اسی طرح مجھے گھورے جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے یوں لگا کہ اس کی نظر کی یہ دھار میرے وجود کے آر پار ہو جائے گی۔ وہ تو بھلا ہوا سامنے بیٹھے ہوئے دیہاتی نما ایک مسافر کا جس نے اپنے کھانے کا ڈبہ کھولا اور سبھی مسافروں کو کھانے کی پیشکش کرنے لگا۔ حالانکہ اس کے لٹن میں بمشکل اتنا کھانا تھا کہ صرف ایک انسان کا ہی پیٹ بھر پاتا لیکن شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ رزق کی برکت اور فراوانی، نیت کی فراوانی سے متصل ہوتی ہے۔ اس شخص کے کھانے کا ڈبہ بھلے ہی خالی تھا لیکن اس کی نیت بھری ہوئی تھی اور باقاعدہ چھلک رہی تھی..... اور اس چھلکا ہٹ کا نور اور اطمینان اس کے چہرے سے بھی صاف عیاں تھا۔ اس نے لجاجت سے مجھ سے بھی کہا..... مینا ایک لقمہ تولے لو..... میری خوشی کی خاطر..... میں نے مسکرا کر ایک نوالہ توڑا اور سالن میں بھگو کر منہ میں رکھ لیا۔ سچ ہے کہ خلوص اور محبت کا اپنا ہی ایک ذائقہ ہوتا ہے جسے اگر زبان کے ذائقے کے غدد و نہ بھی محسوس کر سکیں پر روح اس ذائقے سے بخوبی آشنا ہوتی ہے۔ اس سارے ہنگامے میں کچھ پل کے لیے ہی سہی، پر کم از کم مجھے اس عجیب الخلقت شخص کی گھورتی نگاہوں کے احساس سے نجات ملی گئی۔ کچھ دیر بعد جب میں نے اوپر برتھ کی جانب نگاہ ڈالی تو وہ مرتب چادر تانے لپٹ چکا تھا۔ اگلے صفے میں بیٹھی بہنوں میں سے بڑی والی، جس کا نام ارشد نے ناہید بتایا تھا، نے اپنے ریڈیو کی سوئی گھمائی اور چند سرسراہٹوں کے بعد کسی نغمے کے بول فضا میں گونجے۔

”مالک نے بنایا..... انسان کو۔“

انسان محبت کر بیٹھا.....

وہ اوپر بیٹھا..... کیا جانے.....؟

انسانوں پہ کیا گزری ہے..... گزری ہے.....

دیوانوں سے یہ مت پوچھو..... دیوانوں پہ کیا گزری ہے.....

تبلیغی جماعت میں سے ایک بزرگ جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ دھیرے سے بڑبڑائے ”لا حول ولا..... یہ شاعر حضرات بھی کیا کیا اول فول بکتے رہتے ہیں یہ تو زنا کفر ہے..... بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اسے اوپر بیٹھے کچھ خبر ہی نہیں..... نعوذ باللہ.....“

ساری تبلیغی جماعت نے ان کی بات سن کر اپنا سر دھنا۔ شاید بغاوت اور شکوہ ہم انسانوں کے غیر کے ساتھ ہی گوندھا گیا ہوگا۔ تبھی ہم اپنے شعروں میں، اپنی دہائیوں میں اور اپنی شکایتوں میں اوپر والے سے اپنے حال سے بے خبر ہونے کی فریاد کرتے رہتے ہیں اور شاید اسی لیے وہ شعر اور غزلیں بھی زیادہ مشہور ہوتی ہیں جن میں خدا سے شکوہ کیا گیا ہو۔ کچھ بزدل جو خود اپنے دل کی بات براہ راست خدا سے کہہ نہیں پاتے اور ایسے شعر اور غزلیں پڑھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں جس میں خدا کے سامنے اس کی دی ہوئی تقدیر کی وجہ سے بربادی کے فسانے بیان کئے گئے ہوں۔ شاید اسی لیے انسان کو ازل سے ”نا شکرے پن“ کے طعنے کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاں شکوہ نہ کرنے والوں کا گردہ خود کو خدا سے



زیادہ قریب تر اور پسندیدہ ہونے کا حق دار سمجھتا تھا، وہیں یہ سارے شاعر، ادیب اور ان جیسے دوسرے شکوہ گر بھی خود کو خدا کا سب سے زیادہ لاڈلہ بتاتے تھے۔ اب یہ تو خدائی جانتا تھا کہ ان میں سے زیادہ سچا کون تھا۔ جہنم ”شکوہ کناس“ یا ”شکوہ گریزاں“.....؟

اگلے اسٹیشن پر یہ دونوں شوخ بہنیں بھی اپنے بھائی اور ماں باپ سمیت اتر گئیں۔ جاتے ہوئے بڑی بہن کی نظر میری نظر سے لکرائی۔ مجھے ارشد کی کہی ہوئی بات یاد آگئی اور میرے ہونٹوں پہ خود بخود ایک دھیمی سی مسکان ابھر آئی۔ ہمارے ارد گرد نہ جانے ایسی کتنی کہانیاں بننے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ بعض مرتبہ تو خود ہمیں بھی پتا نہیں چلتا کہ ہمارے مقدر کی کون سی نظر ہم سے چوک گئی ہے۔ محبت کی جانے کتنی داستانیں بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر ارشد کا پھینکا ہوا پرچہ ناہید کے قریب گرتا اور وہ اسے پڑھ لیتی تو کیا ہوتا.....؟ کیا تقدیر صرف اسی قدر لکھے کا نام ہے جو ہمارے ساتھ پیش آتا ہے؟ اور جو ہمارے ساتھ پیش آتے آتے پیش نہیں آتا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر ارشد کے پھینکے ہوئے پرچے کے درمیان میں اس شخص کا کاندھانہ آتا اور وہ رقعہ ناہید کے پیروں میں جا گرتا تو کیا ان کی اس مختصر سی محبت کی کہانی کا انجام کچھ اور نہ ہوتا.....؟ کہیں ہماری بیک وقت دو تقدیریں تو نہیں لکھی گئی ہوتیں.....؟ کہیں ہم ہر بار انجانے میں اپنی اصل تقدیر سے چوک تو نہیں رہے ہوتے.....؟ کہیں خدا نے بندے کو یہ اختیار تو نہیں دے رکھا ہوتا کہ وہ اپنی ہمت اور محنت اور ذرا سی جتنو سے اپنی تقدیر کو بدل سکے.....؟ افسوس میرے پاس سوال تو بہت تھے لیکن جواب ایک بھی نہیں تھا.....

میں نے ایسے ہی کچھ سوال ٹرین سے اترتی ہوئی ناہید کی آنکھوں میں بھی دیکھے۔ شاید وہ بھی اترتے وقت مجھ سے یہی گلہ کر رہی تھی کہ میں نے ارشد سے اس کا مکمل پتا خود ہی پوچھ کر اسے کیوں نہیں بتا دیا.....؟ اب وہ کبھی زندگی بھر اسے دیکھ نہیں پائے گی۔ کسی سے بیاہ کر پہلے بیوی، پھر ماں پھر نانی، داوی بن جائے گی لیکن جاڑے کی خشک رات کی طرح یہ انجانی خلش تا عمر اس کے دل میں کچپی سی پیدا کرتی رہے گی۔ ایک چہرہ وقت کی دھول میں دھندلا کر مٹنے کے باوجود اس کے کورے دل کے آئینے میں اپنا ہیولہ چھوڑ جائے گا۔ نہ جانے کیوں پل میں مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے ناہید اور ارشد کے انجان مقدر کی پرچی کسی اور سے نہیں، خود مجھ سے ہی کہیں گم ہو گئی ہو۔ ناہید کے اتر جانے کے بعد میں خود بھی نہ جانے کتنی دیر یوں ہی گم صم صم سا بیٹھا رہا۔ تاؤ فکیر کوئی زور سے چلایا۔ ”جبل پور آ گیا..... جبل پور.....“

میں نے چونک کر سر اٹھایا تو ٹرین رک چکی تھی۔ میں اپنا مختصر بیگ لے کر اندھیرے اور ویران سے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور ٹرین کے جانے کے بعد صرف میں ہی وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ اچانک مجھے اس سنانے میں پھر سے اپنی دو آنکھوں کی چھین کا احساس ہوا۔ میں چونک کر پلٹا تو دور اندھیرے میں وہی عجیب الخلقت جسامت والا کمزور سا شخص ایک کیمپ پوسٹ کی مریل سی چلی روشنی کے دائرے میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ نہ جانے کیوں پل بھر میں ہی مجھے اپنی ریزہ کی ہڈی میں ایک عجیب سی سنسانہٹ کا احساس ہوا۔ آخر یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا تھا.....؟



## سودوزیاں

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اس شخص سے اس آنکھ بھولی کا مقصد پوچھوں کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ ”کیا آپ کا نام عبداللہ ہے؟“ میں اس قدر محو تھا کہ اچھل ہی تو پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک دیہاتی سا شخص عام مزدوروں کے طے میں کھڑا نظر آیا۔ اس نے اپنا صاف سر پر خوب کس کر باندھ رکھا تھا اور پرانے بوسیدہ گرم کوٹ کو آخری ٹن تک خوب کس کر سینے پر باندھ رکھا تھا۔

”جی..... میں عبداللہ ہوں.....“ اس نے میرا جواب سنتے ہی لپک کر میرا بیگ اٹھا لیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کریم خان صاحب نے بھیجا ہے۔ میرے پیچھے چلے آئیں.....“ میں اس سے یہ بھی نہیں پوچھ پایا کہ یہ کریم خان صاحب کون ہیں جنہوں نے آدھی رات کو اسے مجھے اسٹیشن سے لانے کے لیے بھیجا ہے۔ شاید اس کے انداز میں ہی اتنی بے ساختگی تھی کہ میں نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ اچانک مجھے اس لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے شخص کا خیال آیا اور میں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر میرے قدم جم سے گئے۔ لیمپ پوسٹ خالی پڑی تھی۔ وہاں اب دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اندھیرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ پھر سے میرے رہبر کی آواز گونجی۔ ”بابو جی چلیں..... ہمیں بہت دور جانا ہے.....“ میں چونک کر پلٹا لیکن پلیٹ فارم نکلتے نکلتے بھی میں نے کئی بار مڑ کر دوبارہ اسے تلاش کرنے کی کوشش کی اُسے تو نہ جانے زمین کھا گئی تھی، یا آسمان نکل چکا تھا۔ مجھے زیادہ حیرت اس لیے ہوئی کہ اسٹیشن سے باہر نکلنے کا واحد راستہ صرف وہی بڑا سا آہنی دروازہ تھا جس کے قریب ہم کھڑے تھے، پھر وہ کہاں چلا گیا.....؟

میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو رات کے گہرے اور سفید بادلوں جیسی دھند میں میں نے کریم خان کے بھیجے ہوئے بندے کو ایک تانگے میں کوچوان کی جگہ بیٹھے دیکھا۔ میں بنا کچھ کہے پچھلی نشست پر بیٹھ گیا اور اس نے تانگے کو اینٹوں سے بنی سڑک پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد کوچوان نے اپنی جیب سے ایک بیڑی نکال کر سلگائی اور مجھ سے پوچھا ”بابو جی..... بیڑی پیئیں گے.....؟“ ”نہیں..... میں بیڑی نہیں پیتا.....“ وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔ ”اچھی بات ہے..... یہاں کی بیڑی ویسے بھی کچھ خاص ذائقہ دار نہیں ہوتی۔ بیڑی تو اصلی جبل پور کی ہوتی ہے..... وہی بارڈر پار والا جبل پور..... سنا ہے کہ وہاں بیڑی کے بڑے بڑے کارخانے ہوتے تھے۔ جہاں سے ساری دنیا کو بیڑی بھیجی جاتی تھی..... پھر وہاں سے کچھ مزدور سرحد سے اس پار اس گاؤں میں آکر بس گئے اور انہوں نے یہاں بھی بیڑیوں میں دیسی تمباکو بھرنا شروع کر دیا تو اس علاقے کا نام بھی سرحد پار والے جبل پور کے نام پر پڑ گیا۔ پر جناب، اصل جبل پور تو اسی طرف والا ہے۔ ہمارا والا تو اس کی نقل بھی نہیں..... کیا بات ہے اس طرف کی بیڑیوں کی..... ایک کش میں ہی روح تازہ ہو جاتی ہے..... پر جی میری گھر والی کہتی ہے کہ بیڑی پینا بری لت ہے..... بندے کو آخری عمر میں ٹی بی ہو جاتی ہے..... پر جناب بیڑی نہ پی کر لمبی عمر جینے سے تو یہی بہتر ہے کہ بندہ بیڑی پی کر جلدی مر جائے.....“ وہ لگا تار اور بتار کے بولے جا رہا تھا۔ شاید اسے بہت دنوں سے کوئی اچھا سا



مع میسر نہیں آیا تھا۔ اس کا نام بشیر تھا جواب بشیر اہو چکا تھا۔ یہ تانگا اس کے باپ کے دور کی جاگیر تھا جوڑے کے میں اس کے حصے میں آیا تھا اور یہی وہ واحد تانگا تھا جو گاؤں بھری سوار یوں کو اسٹیشن چھوڑنے اور وہاں سے گاؤں کے لیے اٹھانے کے کام آتا تھا۔ سردی کی وجہ سے دھند بڑھتی جا رہی تھی اور ہم اب ایک کچی سڑک پر مڑ چکے تھے۔ کوئی دور سے ہمیں دیکھتا تو ہم اسے شاید بادلوں میں تیرتے ہوئے ہی نظر آتے۔ گھوڑا اب تیزی سے ہانپ رہا تھا اور اس کے نتھنوں سے گرم بھاپ وقفے وقفے سے ہماری آواز کے ساتھ یوں چھوٹ رہی تھی جیسے کوئی پرانا اسٹیم انجن دوڑا جا رہا ہو۔ بشیر نے تانگے کے بانسوں کے اگلے سرے پر لگے گیس کے دونوں ہنڈولے جلا رکھے تھے اور ان سے پھیلتی دھندلی سی روشنی میں ہم کبرے کی اس چادر کو چیر رہے تھے جس کی وجہ سے ہم گز بھر دور پڑی چیز کو بھی دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے کسی آبادی کے آثار شروع ہوئے اور حسب معمول پہلا استقبال گلیوں کے آوارہ کتوں نے کیا۔ کچھ چیزیں، کچھ باتیں شاید دنیا کے کسی خطے میں تبدیل نہیں ہوتیں۔ رات کا فسون ہر جگہ اور ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ کچھ ڈرانے والا، کچھ چھپانے والا..... اور بہت سے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا۔

تانگا ایک بڑی سی کچی حویلی کے پھانک نما لکڑی کے دروازے کے قریب جا کر رک گیا۔ بشیر نے آواز لگائی۔ ”اوئے کر مو اوئے..... مہمان آئے ہیں..... بوا کھول دے.....“ اندر سے کسی بوڑھے کے کھکانے کی آواز سنائی دی۔ ”آیا.....“ کچھ ہی دیر میں پھانک کھل گیا اور بشیر نے تانگا اندر وسیع صحن میں ہی ہٹا دیا۔ صحن کچھ اینٹوں سے چٹا گیا تھا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ حویلی کا بیرونی صحن ہوگا۔ کیونکہ صحن کے چاروں طرف مہمان خانے کے طرز پر کمرے بنے ہوئے تھے اور سامنے ہی ایک اور ڈیوڑھی نظر آ رہی تھی جس کے اندر ایک دوسرا لکڑی کا دروازہ نظر آ رہا تھا جو اندر والے صحن کی جانب کھلتا تھا۔ بوڑھا کر مو اپنے ہاتھ میں ایک سال خوردہ سی لائین اٹھائے ہماری جانب بڑھا اور اس نے جلدی سے مجھے سلام کیا اور میرا بیگ تھام لیا۔ بشیر نے اسے ہدایات جاری کیں۔

”مہمان کو روٹی ٹکڑا کر کھلا کر منے والے مہمان خانے میں سلا دینا۔ خان صاحب اب صبح ہی ملاقات کریں گے..... کیا سمجھا.....؟“ کر مو نے سر ہلایا۔ بشیر اچھ سے رخصت ہو کر چلا گیا اور کرم دین نے مجھے پرانے طرز کی ایک بیٹھک میں پہنچا دیا جو وہیں صحن کے دائیں طرف بنی ہوئی تھی۔ کمرہ کافی کشادہ تھا اور کھڑکی اس صحن کی جانب کھلتی تھی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے بشیر نے مجھے چھوڑا تھا۔ پٹنگ کیساتھ ایک ڈوری لگی ہوئی تھی جس کا دوسرا سر اچھت پر لگے ایک کنڈے سے ہوتا ہوا ایک بڑے سے کپڑے کے بنے ہوئے ہتھ پکے سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن آج کل سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے ڈوری کو پلیٹ کر پٹنگ کی پائنٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ بائیں طرف دیوار کے اندر ہی ایک بڑی سی انگیٹھی بنی ہوئی تھی جس میں کچھ ہی دیر میں کرم دین نے دھکتے ہوئے انگاروں کی پوری پرات الٹ دی اور کمرہ کچھ ہی دیر میں خشک سے خوشگوار حدت اختیار کر گیا۔ کرم دین عرف کر مو کے اصرار پر میں نے چند تھمے حلق سے نیچے اتارے اور رات ڈھلنے کا انتظار کرنے لگ گیا۔ نیند کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ سہیلی تو ویسے ہی عام حالات میں بھی مجھ سے روٹھی رہتی تھی تو انجان منزل پر بھلا کب میری پلکوں تلے ڈیرہ جمانے والی تھی۔ سو یونہی پلکیں جھپکاتے صبح کی اذانیں سنائی دے لگیں۔ نماز پڑھنے کے بعد میں باہر صحن میں نکل آیا۔ یہ پرانے طرز کی بڑی سی لیکن کچی دیواروں اور کچے دالان والی حویلی تھی۔ کرم دین جو وہیں بیرونی ڈیوڑھی کے پاس ایک چھوٹی سی لوہے کی انگیٹھی ساگے ہوئے بیٹھا تھا اس نے جلدی سے ایک بیڑھا میرے بیٹھنے

کے لیے اسی انگلیٹھی کے پاس رکھ دیا اور خود جلدی سے اپنی کوشٹری سے سلور کی ایک بڑی سی چپک اٹھا کر لے آیا اور مٹی کے پیالے میں گرم گرم چائے انڈیل کر اس نے میرے ہاتھ میں تھادی۔ ہماری زندگیوں میں کچھ تعلق کس قدر مضبوط اور لازم و ملزوم بن جاتے ہیں جیسے صبح سویرے اور چائے کے کپ کا تعلق..... مگر جب چائے ایجاد نہیں ہوئی ہوگی تب لوگوں کی صبح کیسے ہوتی ہوگی؟ میں گرم پیالے کے کناروں سے نکلتی بھاپ کے عقب میں کرم دین کے تھریوں بھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر انہی سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ ہمارے شہروں میں صبح ہمیشہ ایک چہم سے کود کر اور ایک پیچھے چنگھاڑتے شور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب کہ یہ دور دراز کے گاؤں اور علاقے ہر روز صبح کو ایک مہربان اور نرم اجالے کی طرح خود پر وارد ہوتا محسوس کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا عموماً مرغ کی بانگ، چرے کی کوک اور پن گھٹ پر لگے ہینڈ پمپ کی چوں چوں سے ہوتی ہے۔ مویشی اور ڈھوڑا گرج چوک کر سر اٹھاتے ہیں اور بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی ٹن ٹن بج اٹھتی ہے۔ رات بھر جاگنے کے بعد کھیت کی رکھوالی کرنے والے راکھے لمبی لمبی جھانپاں لیتے ہوئے منہ اندھیرے گھر کو لوٹتے ہیں تو ان کے قہقہے راہوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں پن بجلی کی سیٹی بھی بلند ہوتی ہے۔ گھروں کے آگن میں دودھ اور لسی بلونے کی رڈک گونجنے لگتی ہے۔ بڑے بڑے اور بزرگ کھنکھار کر جوانوں کی مست نیند میں رخنہ ڈالنے لگتے ہیں اور پھر کچھ ہی دیر میں مشرق کی جانب سے ایک گلابی آگ فلک کو دھکانے لگتی ہے جو دھیرے دھیرے سنہری آتشیں رنگت دھار لیتی ہے اور یوں نہ جانے کتنے مرحلوں کے بعد سورج اپنا دمکتا مکھڑا دھیرے دھیرے سر کا تا ہوا گاؤں کی ایک روشن صبح کو مکمل کرتا ہے۔ اتنی خوب صورت صبحوں کے چشم دید گواہ یہ گاؤں والے تھی تو اتنے ابلے چہروں اور پاک من کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ صبح میری زندگی کی ان چند صبحوں میں سے ایک تھی جسے میں نے گھونٹ گھونٹ جیا تھا۔ بالکل اس گرم بھاپ اڑاتی چائے کے پیالے کی طرح..... جو اس وقت میرے ہاتھوں میں تھا تھا۔ میں نے آخری گھونٹ لیا ہی تھا کہ اندرونی پچاٹک کھلا اور اس میں لمبے قد کا ایک رعب دار شخص اپنے سر اپنے کو گرم کھس میں پیٹے اندر سے برآمد ہوا۔ دونوں کراس کے دائیں بائیں اس کا حقہ اور تبا کو وغیرہ اٹھائے ہوئے تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ اس نے آتے ہی مجھے زور سے بھینچ کر گلے لگالیا۔

”معاف کرنا جی..... رات کو مجھے ذرا تپ چڑھ گئی تھی۔ دوپٹی تو اونگھ آ گئی اور میں آپ کا استقبال نہیں کر سکا۔ میرا نام کریم خان ہے..... سلطان بابا نے آپ کے آنے کی خبر کر دی تھی۔ پر آپ تو بالکل نوجوان ہو جی..... میں سمجھا تھا کہ سلطان بابا نے پہاڑی والی درگاہ کی خدمت کے لیے کسی بزرگ کو بھیجا ہوگا.....“

اوہ..... تو میری ڈیوٹی جبل پور میں لگائی گئی تھی۔ یہ تو مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہئے تھا جب سلطان بابا نے مجھے کلٹ دے کر جبل پور کے لیے روانہ ہونے کو کہا تھا۔ لیکن اتنی دور..... ملک کے اس دوسرے کونے میں بھیجے کی کوئی خاص وجہ ہی ہوگی۔ صرف درگاہ کی خدمت ہی کرنی ہوتی تو سلطان بابا یہیں جبل پور کے آس پاس سے کسی خدمت گار کو ہی بھجوا دیتے۔ کریم خان نے مجھے بتایا کہ سلطان بابا سال چھ مہینے میں یہاں کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ گاؤں سے پرے پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ میں مدفون بزرگ بھی کریم خان کے آباؤ اجداد سے ہی تعلق رکھتے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپاہیوں میں شامل تھے اور دین کی حفاظت کرتے ہوئے انہی سپاہیوں کے ساتھ شہید ہو گئے تھے جنہوں نے اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جانیں، جاں آفریں کے سپرد کی تھیں۔ تب سے لے کر اب تک اس درگاہ پر جلتا دیا کبھی بجھے نہیں دیا گیا تھا اور



اسے ایک نور کے استعارے کے طور پر لیا جاتا تھا۔ جو اس دنیا میں ظلم اور کفر کے اندھیرے کو مٹانے کی نشانی کے طور پر روشن رکھا گیا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اللہ کے وہ سارے نیک بندے جو ایسی درگاہوں اور مقبروں میں مدفون تھے جنہوں نے خدا کی وحدت اور اس کے کلمے کی خاطر اپنی جان دی، یا اپنی ساری زندگی لوگوں کو یہ سمجھانے میں بتادی کہ اللہ ایک ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں ہے، انہیں اپنے مزاروں پر شرک جیسی بدعات کو دیکھ کر کس قدر اذیت ہوتی ہوگی۔ جب وہ یہ دیکھتے ہوں گے کہ لوگ انہیں وسیلہ بنا کر خدا سے مانگنے کے بجائے خود انہی سے آس لگائے بیٹھے ہیں تو ان کی روح کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ کریم خان صاحب نے بڑی محبت سے مجھے دو پہر کے کھانے تک حویلی میں ہی رکنے کی درخواست کی اور پھر سہ پہر کو جب بشیر اپنا تانگا حویلی کے بیرونی صحن میں لگا چکا تو وہ کپڑے کی چند پٹلیاں سنبھالے مجھے تانگے پر سوار کرانے آ پہنچے۔ ان پولیسوں میں گڑ، پٹے، اخروٹ اور بادام اور ایسی ہی چند اور چیزیں تھیں۔ جو خان صاحب بطور خاص میرے لیے لے کر آئے تھے۔ میں نے ان کے خلوص کو تکلف کا رنگ لگا کر داغ دار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خوشی سے ساری پٹلیاں تانگے کی پچھلی نشست پر رکھوا دیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ درگاہ کے گودام میں ابھی مہینے بھر سے کچھ زیادہ کا ہی راشن پڑا ہوا گا پھر بھی اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں بلا جھجک ان سے کہلوادوں۔ بشیر اہر جمعرات کی شام کو دینے کا تیل بدلنے کے لیے درگاہ جاتا تھا۔ اسی کو میرے اور خان صاحب کے درمیان پیغامبر کے فرائض سرانجام دینا تھے۔ بشیر نے تانگا موڑا ہم حویلی کا چھانک کر اس کر کے نکلے ہی تھے کہ اچانک خان صاحب کو جیسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی۔ وہ جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ”ہاں عبداللہ بیٹا..... ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ آج کل درگاہ میں کوئی سائل آ کر ٹھہرا ہوا ہے۔ بڑا پریشان اور مجبور لگتا ہے۔ اپنی کسی منت کے پورے ہونے کی آس میں اپنا گھر بار اور آرام تیاگ کر اس دیرانے میں پڑا ہوا ہے۔ تمہیں کچھ دن تک اسے بھی اپنے ساتھ ہی رکھنا ہوگا۔ بہت پریشان ہے بے چارہ.....“ ”آپ بے فکر رہیں..... میری جانب سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔“ بشیر نے گھوڑے کی لگا میں ڈھیلی کر دیں اور رکھنے ہی دیر میں تانگا گاؤں سے باہر جاتی اسی سڑک پر دوڑ رہا تھا جو بہت دور جا کر محبوب کی کمر کی طرح اچانک ہی ختم کھا گئی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے اور صاف شفاف تازہ پانی کی ایک تالی بہہ رہی تھی جس میں بجتے پانی کی ٹھنکھروں جیسی سرگم اور تانگے کی ٹپ ٹاپ ٹپ ٹاپ مل کر ایک مدھر سی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔ ہماری زندگی میں باتیں تو ہمیشہ ہی بولتی ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ سناٹا ہم سے بات کرے۔ گاؤں کی نارنجی خزاں رسیدہ چٹوں سے ڈھکی اس سڑک کے سناٹے اور اس کے کنارے دوڑتے پانی کے اس نالے کی ترنم نے بھی اس دن مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ بشیر نے کو جب سے پتا چلا تھا کہ میں درگاہ کا نیا مجاور ہوں تب سے اس کا انداز کافی عقیدت مندانہ سا ہو گیا تھا۔ حویلی میں ہی وہ کئی بار مجھ سے یہ درخواست کر چکا تھا کہ میں اس کے لیے اولاد دینے کی ”منت“ ضرور مانگوں بدلے میں بیٹا ہونے پر وہ مجھے پورے ایک سو اکیاون روپے اور گڑ کی پوری ایک بوری نذر کرے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ ”ایک سو اکیاون روپے میں وہ پورا بیٹا مانگ رہے ہو، کم از کم پورے دو سو ایک روپے کی منت تو ہونی چاہئے۔“ بشیر نے چونک کر پیچھے میری طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر میری آنکھوں میں شرارت کی تحریر پڑھ کر وہ بھی زور سے ہنس پڑا۔ ”واہ جی..... جی خوش کر دیا آپ نے بشیرے کا..... اب مجھے پورا یقین ہے کہ بشیرے کی دعا بھی ضرور پوری ہوگی.....“ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس یقین کے ساتھ خود خدا سے دعا کیوں نہیں کرتا کہ اللہ اسے بیٹا عطا کرے۔ جواب میں اس نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”ناجی نا..... بھلا یہ گناہ گار بشیر اس

قابل کدھر کہ خود اللہ میاں سے کچھ مانگ سکے..... اور پھر بشرے کا مانگنا تو صرف مانگنا ہوگا نا جناب..... لیکن آپ لوگ تو اللہ جی سے ضد بھی کر سکتے ہو..... یہ کام صرف مانگنے سے نہیں ہوتا جی..... یہ تو ضد والا معاملہ ہے..... صرف دعا سے ہی بیٹا ملنا ہوتا تو میری گھر والی پچھلے سات سال سے جعدے میں نہ گری ہوتی.....“ میں نے چونک کر بشرے کی جانب دیکھا۔ اس سیدھے سادھے سے دیہاتی نے دعا کا کتابڑا کلیہ بتا دیا تھا مجھے۔ لیکن کیا واقعی ہم اللہ سے ضد بھی کر سکتے تھے؟ اور اپنی خواہشیں اور دعائیں ضد کر کے بھی اس سے منوا سکتے ہیں؟ جب کبھی بہت لاڈلہ بچہ اپنی پسند کا کھلونا نہ ملنے پر گھر کے صحن میں پیر پٹخ پٹخ کر آسمان سر پر اٹھالیتا ہے تب یا تو اسے اپنی ماں سے مار پڑتی ہے، یا پھر متا کی ماری ماں کسی بھی طرح مانگ تا نگ کر اسے وہ کھلونا دلوایا دیتی ہے۔ تو کیا یہی کلیہ اس ستر ماؤں سے زیادہ بیا کر کرنے والے کے ہاں بھی چل جاتا ہوگا؟ وہاں تو مار پڑنے کا بھی امکان نہیں تھا تو پھر ہم انسان اپنے خدا سے ضد کیوں نہیں کرتے.....؟ کہیں یہ ہمارے عقیدے کی کمزوری تو نہیں؟ کہیں ہم طلب اور دعا کے اصل اصول سے ناواقف تو نہیں.....؟

تا نگا اب اس دور و یہ ایستادہ درختوں والی سڑک سے آگے بڑھ کر ایک کھلے میدان والی سڑک پر دوڑ رہا تھا اور دور پہاڑی پر واقع ایک چھوٹی سی درگاہ کے آثار اب دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگے تھے۔ آخر ہم اس مقام پر بھی پہنچ گئے جہاں سے آگے تا نگے کے راستے کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ بشرے نے بہت اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ ہی میرا سامان اٹھا کر اوپر پہاڑی تک جانا چاہتا ہے لیکن میں نے وہیں سے اسے رخصت کر دیا۔ جاتے جاتے میں نے اسے ایک بار پھر چھیڑا ”یہ تو بتاتے جاؤ کہ اگر اس بار واقعی بیٹا ہوا تو اس کا نام کیا رکھو گے..... کچھ سوچا ہوا ہے پہلے سے کہ نہیں.....“ بشرے اجاتے تا نگے پر بیٹھ کر اپنا چھانٹا پکڑ چکا تھا دھیرے سے مسکرایا اور اس نے میری جانب غور سے دیکھا..... پہلے تو نہیں سوچا تھا جی..... پر اب سوچ لیا ہے..... میں اس کا نام ”عبداللہ“ رکھوں گا.....“ بشرے زور سے ہنسا اور تا نگا کچی سڑک پر ٹپ ٹپ کی دھن پر دوڑنے لگا۔ میں کچھ دیر تک اپنے اس نئے بنتے رشتے کو دیکھتا رہا۔ ہم انسان کس قدر بھولے اور نازک ہوتے ہیں۔ کتنی جلدی رشتوں کے کوئل دھاگے اپنی روح کے ریشوں سے جوڑ لیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم پل پل ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں۔ خدا نے ہمارے اندر احساس نام کا یہ جو جذبہ رکھا ہے یہ ہمیں کسی کروٹ جھین نہیں لینے دیتا۔ ایک آس ٹپتی ہے تو دوسری جنم لیتی ہے۔ بشرے ابھی ایک نئی آس لیے واپس جا رہا تھا۔

جب میں اپنا سامان لیے اوپر چوٹی پر بنی درگاہ کے کچے صحن میں پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ دسمبر کی کچی دھوپ میں بھی میرا ہاتھ پسینے سے بھیک چکا تھا اور اسی پسینے نے میرے ماتھے سے ٹپک کر درگاہ کی سرزمین کو اپنا پہلا سجدہ پیش کیا۔ میں کچھ دیر وہیں صحن میں بیٹھ کر سستا تا رہا۔ میرے ارد گرد درجنوں کبوتر اور چڑیاں دانہ چک رہی تھیں۔ شاید کوئی کچھ دیر پہلے ہی انہیں دانہ ڈال گیا تھا۔ درگاہ کے صحن کے وسط میں مضبوط ٹین کی چادروں والی چھپر کے نیچے ایک قبر بنی ہوئی تھی جس کے اوپر سبز چادر اور کچھ پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خشک پتیاں تیز ہوا سے بکھر کر صحن میں پھیل رہی تھی۔ اچانک میرے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا تو ایک کچی عمر کا مردشانوں پر کمبل ڈالے اور ہاتھ میں جلانے والی لکڑی کے چند ٹکٹے لیے اپنی جانب آتا نظر آیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ وہ قریب آ گیا اور میری جانب ہاتھ بڑھا کر بولا ”اوہ..... تو تم ہو عبداللہ..... مجھے خان صاحب نے تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا نام اصغر ہے..... اصغر احمد..... میں اپنی ایک منت کے سلسلے میں کچھ دن کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں..... اچھا ہوا تم آ گئے..... کبھی کبھی بہت تنہائی کا احساس ہوتا تھا یہاں.....؟“



میں چاہتے ہوئے بھی ان سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ کون سی منت تھی جس کی خاطر وہ اس دیرانے میں پڑے ہوئے تھے۔ کیوں کہ بظاہر اپنے حلیے سے وہ صاحب کافی متول خاندان سے دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھ میں انتہائی قیمتی گھڑی، گلے میں سونے کی چین، انگلیوں میں ہیرے کی تین تین انگوٹھیاں اور چہرے پر دولت کی وہ خاص چمک جو اس درگاہ کے غریبانہ سے ماحول میں بھی اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔ میں نے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... چلیں اگر تنہائی صرف ایک سے دو ہونے سے ختم ہو سکتی ہے تو پھر وہ نفری تو میری آمد نے پوری کر دی ہے..... امید ہے ہمارا وقت اچھا گزرے گا۔“

کچھ ہی دیر میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میں نے اصغر صاحب کو نماز کی دعوت دی لیکن مجھے ان کا جواب سن کر ذرا سی حیرت ہوئی۔  
 ”نہیں عبداللہ میاں..... میں اپنی نمازیں تنہائی میں ہی ادا کرتا ہوں..... دراصل اس کا تعلق بھی میری منت سے ہی ہے۔ امید ہے تم برا نہیں مانو گے.....“

”نہیں نہیں..... اس میں برائے کی کیا بات ہے..... نماز آپ کا اور خدا کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ اپنی نماز ادا کریں، میں اپنی نماز پڑھ لوں گا.....“ وہ اٹھ کر درگاہ کے صحن میں بنے ہوئے کچے کمروں میں سے ایک کی جانب بڑھ گئے۔ میرے رہنے کا انتظام بھی انہی کمروں میں سے ایک میں کیا گیا تھا لیکن میں نے وہیں صحن میں بچے جائے نماز پر عصر پڑھ لی۔ حسب معمول نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی مجھے اسی ازلی بے چینی اور مختلف دوسووں اور خیالات نے آگھیرا جو ہمیشہ سے میرے اور میری نماز کے درمیان حائل تھے۔ شتم پشتم نماز پڑھ کر میں نے سلام پھیرا اور یوں ہانپنے لگا جیسے میلوں دور سے دوڑ کر آ رہا ہوں۔ مولوی خضر نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی نمازیں جو صرف زمین پر ماتھا ٹکانے کی حد تک ادا کی جاتی ہوں، وہ پلٹ کر واپس نمازی کے چہرے پر مار دی جاتی ہیں۔ شاید تبھی اپنی ہر نماز کے بعد مجھے اپنے چہرے پر ایک ان دیکھے طمانچے کا احساس ہوتا تھا۔ اس دن بھی میں نے اپنی نماز کو فلک چھوئے بنا ہی واپس پلٹتے ہوئے محسوس کیا اور اسی بے چین دل کے ساتھ درگاہ کی کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سامنے چھت کی منڈیر سے سرکتی دھوپ مجھے یہ احساس دلارہی تھی کہ میری زندگی کا ایک اور قیمتی دن ضائع ہو کر گزر گیا ہے..... آج بھی میں نے روز کی طرح صرف اپنا وقت ہی کھو یا تھا..... بدلے میں کچھ پانہیں سکا۔



## درد اور مسیحا

اگلے روز صبح سویرے نیچے گھاٹی میں جبل پور کے ڈاکے کی سائیکل کی مخصوص گھنٹی سنائی دی۔ اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ میں درگاہ کے صحن میں نکلا تو ڈاکیا اپنا خاک کی تھیلا لٹکائے سر زھریاں چڑھ کر اوپر آتا نظر آیا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اصغر صاحب کے لیے کوئی خط آیا ہوگا۔ ڈاکیا مجھے عبداللہ کے نام سے جانتا تھا لیکن اس کی بات سن کر میں زور سے چونک پڑا۔

”جناب یہاں کوئی ساحر صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں کیا.....؟“

اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں خود ساحر ہوں۔ ”کیوں؟..... خیر تو ہے.....“

”جی سب خیر ہے..... اس کے نام کا ایک خط آیا ہے۔ پتا اسی درگاہ کا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ساحر کے نام کے سامنے چھوٹے حاشیے میں آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔“

میں نے ڈاکے سے خط لے لیا اور خط پر لکھی تحریر دیکھتے ہی میری سانسیں جیسے رکنے لگیں۔ وہ زہرا کی تحریر تھی۔ ہاں..... اسی کے کوئل ہاتھوں کی انگلیوں کے شاہکار لفظانے پر جھگوڑا رہے تھے۔

میں زہرا کی تحریر لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ حرف بھی تو ہم انسانوں جیسی ہی پہچان رکھتے ہیں ان میں سے ہر حرف اپنا ایک چہرہ رکھتا ہے اور میں زہرا کے ہاتھ سے بنے ان سیاہ خاکوں کو خوب پہچانتا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے لفظ کھولا اور میری نظر سفید کاغذ پر بکھرے ان موتیوں پر پھیلنے لگی۔

”آداب.....“

مجھے ہر پل یہ احساس کیوں ستاتا ہے کہ آپ کو اس راہ پر دھکیلنے کے بعد میں خود ہی بار بار آپ کی راہ کا نشان بن جاتی ہوں۔ میں اور اماں اس وقت کمال آباد میں ہیں۔ زندگی کی کروٹ کسی جانب سر نہانے نہیں دیتی۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کا پتا پرانی درگاہ سے ملا۔ اس تحریر میں پوری بات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ ہو سکے تو جلد از جلد کمال آباد میں نیچے دیئے گئے پتے پر پہنچ جائیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اماں کی ضد ہے کہ آپ کو ضرور خبر کر دی جائے۔ شاید وہ بھی میری طرح بالکل ٹوٹ گئی ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔

..... زہرا۔“

خط کیا تھا، ایک معر تھا۔ اصغر صاحب غور سے میرے سامنے کھڑے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ میں نے مختصر لفظوں میں انہیں بتایا کہ کوئی بہت خاص ہے جسے اس وقت میری ضرورت ہے وہ خوش دلی سے مسکرا کر بولے کہ ”میاں! کچھ خاص لوگ ہی ہوتے



ہیں جنہیں کسی ضرورت، یا مصیبت میں پکارا جاتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر وہاں سے ہو آؤ یہاں کا دھیان رکھنے کے لیے میں موجود ہوں۔“

کمال آباد جکشن جبل پور سے تقریباً دو گھنٹے ٹرین کی مسافت پر تھا۔ میں شام کی گاڑی لے کر کمال آباد پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سارے راستے میرے ذہن میں یہی بات گردش کرتی رہی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کمال آباد کے اسٹیشن پر میں نے جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ زہرا ہی تھی؟ لیکن زہرا تو پردے کا بے حد اہتمام کر کے گھر سے نکلتی ہے پھر یوں بے نقاب.....؟؟ میں جتنا سوچتا گیا الجھن بڑھتی گئی۔ زہرا نے خط میں جس ”کاسنی حویلی“ کا پتا لکھا تھا وہاں تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی اور جب میں سائیکل رکشہ سے حویلی کے مرکزی لیکن بوسیدہ سے پھانک پر اترا تو مجھے حویلی کے نام کی وجہ تسمیہ بھی پتا چل گئی ساری حویلی کاسنی رنگ کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ باہر کوئی دربان موجود نہیں تھا اور آدھا ٹوٹا، ٹکٹا ہوا پھانک تیز ہوا میں جھول رہا تھا۔ باہر سے گزرتا کوئی بھی راہ گیر ایک ہی نظر میں درود یوار کی شکستہ حالی سے اندر مکینوں کا حال جان سکتا تھا۔ سالہا سال سے بن قلعی کے در و بام سے عجیب سی وحشت نپک رہی تھی۔ میں اس شش و پنج میں حویلی کے پھانک سے چند قدم اندر تو بڑھ آیا تھا لیکن اب کاسنی پھولوں کی کیاریوں سے متصل روش پر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اندر والوں کو اپنے آنے کی خبر کیسے کی جائے؟

اچانک اندر کی جانب سے ایک آہٹ ہوئی کسی عورت کے ہلکے سے کھکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں اسے دیکھ کر زور سے چونکا۔ یہ وہی عورت تھی جو اس دن ریلوے اسٹیشن پر مجھے زہرا کے ساتھ دکھائی دی تھی۔ میرے سلام کا جواب دینے کے بعد اس کا اگلا سوال میرے لیے ایک او ر حیرت لے کر آیا۔ ”کیا تم عبداللہ ہو؟“ جواب میں میں صرف اثبات میں سر ہی ہلا سکا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کر کے پلٹ گئی۔ میں نیم اندھیری سنسان اور شکستہ راہ داریوں میں سے ہوتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ حویلی اگرچہ کھنڈر ہو چکی تھی لیکن اس کے آثار اب بھی اس کے گزشتہ مکینوں کی شان و شوکت کا پتا دیتے تھے۔ اچانک ہی مجھے اس عورت کے پیچھے چلتے چلتے ان اندھیری غلام گردشوں سے ایک انجانے سے خوف کا احساس ہوا۔ جانے وہ کون تھی اور مجھے کہاں لے جا رہی تھی۔ آخر کار وہ ایک بڑے لیکن شکستہ حال کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس وقت مجھے ادراک ہوا کہ حویلی کی بجلی کٹی ہوئی تھی اور چند کمزور موم بتیوں اور دیو کی نامکمل روشنی کی وجہ سے وہ ماحول اور بھی پراسرار ہو گیا تھا۔ اندر کمرے میں حیرت کا دوسرا شدید جھکا میرا منتظر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی پہلی نظر میں اس عجیبے چرخوں کے اجالے میں وہ مجھے زہرا ہی دکھائی دی اور میں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ قریب تھا کہ میں اسے زہرا کے نام سے ہی پکار لیتا لیکن اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں جب مجھے سلام کیا تب میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ آواز زہرا کی نہیں تھی۔ ہاں..... وہ زہرا نہیں تھی اور قریب سے دیکھنے پر اس کی زہرا سے اچھی خاصی مشابہت کے باوجود چند واضح فرق محسوس کئے جاسکتے تھے۔ اس کا چہرہ ڈھکا ہوا نہیں تھا اور وہ قدمیں زہرا سے کچھ کم تھیں اور اس کی آنکھیں بھی گہری کالی کی بجائے نیلگوں سی تھیں اور شاید نیند، یا خوراک کی کمی کی وجہ سے آنکھوں کے گرد ہلکے سے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ہڑبڑا کر اسے جواب دیا۔ ”علیکم السلام۔“ وہ لڑکی کمرے سے نکل گئی۔ عورت بولی۔ ”یہ میری بیٹی ہے زریاب..... یہ نام اس کے والد کو بہت پسند تھا۔ انہوں نے بڑے چاؤ سے رکھا تھا۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس عورت کی جانب دیکھا۔ دراصل مجھے زہرا مقبول نے یہاں آنے کی لئے.....“ اس نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ ”ہاں..... میں جانتی ہوں..... زریاب کا پورا نام زریاب مقبول ہے..... وہ زہرا کی سوتیلی بہن ہے.....“ یہ تیسرا جھکا اس قدر شدید تھا کہ میں

اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ”جی..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ ”ہاں..... میں حاجی مقبول حسین کی پہلی لیکن مطلقہ بیوی ہوں..... مجھے طلاق دینے کے بعد ہی انہوں نے زہرا کی ماں سے شادی کی تھی۔ تمہاری آمد کی اطلاع مجھے زہرانے ہی کی تھی۔“ میں نے بے چینی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ”لیکن زہرا کہاں ہیں.....؟“ ”تم نے آنے میں کچھ دیر کر دی۔ وہ لوگ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اپنے شہر کی گاڑی پکڑنے کے لیے نکل چکے ہیں۔ تمہارے لیے زہرانے یہ لفافہ دیا ہے۔ دراصل مقبول صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ بس خدا اپنا رحم کرے۔“ میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ ”اگر وہ لوگ صرف آدھا گھنٹہ قبل یہاں سے نکلے ہیں تو شاید میں انہیں ریلوے اسٹیشن پر آخری لمحات میں مل پاؤں گا.....؟“ مجھ سے ایک پل بھی مزید وہاں نہیں ٹھہرا گیا۔ وہ مجھے روکتی ہی رہ گئیں کہ میں کم از کم ایک بیانی چائے تو پیتا جاؤں لیکن میں ان سے دوبارہ آنے کا کہہ کر تیزی سے باہر کسی سواری کی تلاش میں لپکا۔

میں نے ٹرین کی پہلی سیٹی کی آواز اس وقت سنی جب میں اپنی دھونکی جیسی پھولتی سانس کے ساتھ دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم کے مرکزی دروازے سے اسٹیشن کے اندر داخل ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ انسانی نظر ایک پل میں کتنے مناظر اپنی بصارت میں سمیٹ سکتی ہے لیکن اس ایک لمحے میں میری آنکھوں نے پوری گاڑی کا یوں جائزہ لیا جیسے میری بصارتیں ہزار گنا بڑھ گئی ہوں لیکن وہ کہاں تھی جسے نہارے بنا میری دو آنکھوں کا یہ نور بس اس نعمت کا ایک زیاں ہی تو تھا۔ گاڑی نے دوسری سیٹی بجائی اور میری حالت اس وحشی کی طرح ہونے لگی جو اپنے جنوں میں نفس کی سنگلاخ دیواروں سے سرکھرانے کے لیے اپنی زنجیریں تڑوانے کی کوشش کرتا ہے۔ جانے پل بھر میں ہی کیوں مجھے وہ گاڑی ٹین اور لوہے کا جوڑ نہیں بلکہ ایک عفریت نظر آنے لگی جو کچھ ہی پل میں میری آخری سانس بھی مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ میں نے دیوانوں کی طرح ایک سمت قدم بڑھائے۔ ٹرین کو پہلا جھٹکا لگا۔ جب تک میں خود اپنی مرضی سے زہرا سے دور تھا تب تک میرے دل کو ایک انجانی سی ڈھارس تھی کہ وہ دور سہی پر قریب ہے، لیکن آج جب وہ میرے وجود کے اتنے نزدیک ہو کر بھی میری آنکھوں سے اوجھل تھی تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کسی کند چھری سے میرا سینہ چیر کر اسے میرے دل میں پیوست کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرا سارا صبر، تمام چین و قرار ایک پل میں ہی لٹ گیا تھا۔ یہ جلا دودل بھی ہم معصوم انسانوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں چند گھنٹوں میں ہی وہی پرانا ساحر بن گیا ہوں جو ساحلی درگاہ پر ایک کارریجس جیتنے کے بعد چند لمحوں بعد ہی زہرا کی پہلی نظر کا شکار ہو کر وہیں اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا پاکا۔ ایئر کنڈیشنڈ سلپر، ہاں..... اس نازک اندام کو تو وہیں ہونا چاہئے۔ میں تیزی سے پلٹا۔ گاڑی نے دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے ہی اے سی والی بوگی تھی۔ دفعۃً میری سماعتوں کو دھوکا سا ہوا۔ ”ساحر.....“ یہ تو وہی روح میں اتر جانے والی آواز تھی۔ میں تڑپ کر پلٹا۔ ہاں..... وہ زہرا کی ہی آواز تھی۔ اے سی سلپر بوگی کی ایک ادھ کھلی کھڑکی سے میری سدا گردش میں رہنے والی نقدیر کا واحد روشن تارہ جھلک رہا تھا۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اس کا ڈبہ چوخی کی رفتار سے میری نظروں کے سامنے سے گزرا۔ وہ بے چینی سے پھر بولی۔ ”ساحر..... گاڑی چھوٹ رہی ہے.....“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی بوگی مجھ سے چند قدم آگے بڑھ چکی تھی۔ میں کھڑکی سے جھانکتی زہرا کی جانب لپکا ٹرین کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے آواز نہیں نکل پائی۔ میرے شکستہ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میری پلکیں جھپکنے لگیں۔ وہ تڑپ کر بولی ”خود کو سنبھالیں ساحر، میں نے سب کچھ خط



میں لکھ دیا ہے۔ پڑھ لیجئے گا..... اور اپنا خیال رکھیے گا.....“ گاڑی نے مزید رفتار پکڑ لی۔ میری نظر زہرا کی نگاہ میں گڑھ کر رہ گئی تھی۔ میری بصارت کیلئے دیگر ہر منظر جیسے دھندلا سا گیا تھا۔ وہ ٹرین، پلیٹ فارم، سیٹی بجاتا ٹی، وہاں پھرتے دیگر لوگ، وینڈنگ کنسٹرکٹر، سارے قلی، کھرے میں لپٹی شام، گیس کے بندولوں کی ملگجی پیلی روشنی کے دائروں میں ڈوباواہ اسٹیشن، سب کچھ پل بھر کے لیے اوجھل سا ہو گیا۔ صرف میں اور وہ رہ گئے۔ میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ میرے گھائل قدم کسی چیز میں الجھ کر لڑکھڑائے اور میں گرتے گرتے بچا۔ زہرا نے بے قرار ہو کر بے اختیار اپنا ہاتھ یوں بڑھایا جیسے مجھے گرنے سے بچانا چاہتی ہو۔ لیکن لوہے کی پڑی سے جڑے فاصلے تیزی سے اسے مجھ سے بے ہوش کر رہے تھے۔ اس کا ہاتھ یونہی فضا میں اٹھا رہ گیا۔ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اس کی پلکیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ اس کے لب ہلے، لیکن پیوں کی گڑ گڑاہٹ نے میرے نصیب کے لفظ بھی میری سماعتوں سے چھین لئے۔ جانے اس نے کیا کہا تھا؟ شاید ”الوداع“..... لب تو میرے بھی ہلے تھے لیکن اپنے حرف تو میں خود بھی نہیں سن سکا تو بھلا اس ناز خراماں کو کیا سنائی دیتے.....؟ کچھ ہی پل میں ہمارے درمیان وہی زمینی فاصلے حائل ہو گئے جو ہمیشہ سے اس نصیب جلی محبت کا مقدر ہوتے ہیں۔ ٹرین پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کافی آگے بڑھ چکی تھی اور اب دھیرے دھیرے اس کھر آلود اندھیرے کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ تیزی سے دوڑتی گاڑی کی جانب سے میری طرف بڑھتے مرد ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے میرے گالوں تک پہنچے دو آنسوؤں کو مخالف سمت میں دھکیل کر اس فضا کا ایک حصہ بنا دیا۔ نہ جانے پانی کی وہ دو نمکین بوندیں کس بد نصیب کے دل کی زمین پر جا کر گری ہوں گی۔ لیکن جہاں بھی گری ہوں مجھے یقین تھا کہ سب کچھ جلا کر بھسم کر گئی ہوں گی۔

میں نے جیب سے زہرا کا خط نکال کر وہیں پلیٹ فارم کے ایک بچ پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لیا۔ زہرا کی سوتیلی ماں کا نام نگار تھا اور انہیں اور زریاب کو میری جس مدد کی ضرورت تھی، وہ فوری نوعیت کی نہ ہونے کے باوجود اہم تھی۔ میں نے وہیں اسٹیشن کے تارگھر سے ہی پاپا اور اپنے دوست کاشف کو تار بھیجے اور خط کے بکسے میں خط بھی ڈال دیئے اور کاسنی حویلی کے نام ایک خط لکھ دیا کہ وہ مطمئن رہیں میں نے حکام بالا کو اطلاع کروادی ہے اور جلد ہی دوبارہ ان سے آکر ملوں گا۔

اس تمام مصروفیت سے فارغ ہو کر میں رات کی آخری گاڑی لے کر جب جبل پور واپس پہنچا تو صبح کا سپیدہ نمودار ہو رہا تھا۔ میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کی طبیعت پہلے سے اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔ انہیں سارا احوال بتا کر میں درگاہ کے پچھلے ایک بختے کے ترک شدہ معمولات میں جٹ گیا۔ لیکن سارا وقت میرے ذہن میں نگار اور زریاب سے متعلق زہرا کے لکھے ہوئے خط کے الفاظ گھبراتے رہے۔ اگلی صبح میں گاڑی پکڑ کر کمال آباد بھی ہوا یا۔ میری توقع کے مطابق پاپا اور کاشف نے تمام متعلقہ حکام کو کاسنی حویلی کے مسئلے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ درگاہ میں میرے لیے کاشف کا ایک خط بھی موجود تھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ کمال آباد میں حالیہ تعینات اے ایس پی ہمارا ہی ہم جماعت خالد تھا جو ایس ایس کرنے کے بعد پولیس جوائن کر چکا تھا۔ خالد مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوا اور اس نے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین بھی دلایا۔

زہرا کے خط سے مجھے یہ تو پتا چل ہی چکا تھا کہ اس کی بھی اپنی ماں سمیت زریاب اور نگار سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ لیکن کہانی آج سے نہیں

بلکہ بائیس سال پہلے شروع ہوتی تھی جب زہرا کے والد مقبول خان اپنی گریجویشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسرے شہر پہنچے تھے۔ والدین کی اکلوتی اولاد اور بے پناہ دولت کی وجہ سے شاہانہ مزاج اور شہزادوں جیسی عادات تو شروع سے ہی تھیں، رہی سہی کسر جوانی نے پوری کر دی تھی اور شاید انہی چیزوں کے امتزاج کی بدولت انہی کی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ نگار چند دنوں بعد ہی اپنا دل ان کے قدموں میں ہار بیٹھی۔ مقبول بھی زیادہ عرصہ مزاحمت نہ کر سکے اور دونوں ایک جاں دو قالب کی تفسیر بن گئے۔ مقبول کو اتنا اندازہ ضرور تھا کہ ان کے والد یوں بیچ تعلیم انہیں کسی بندھن میں بندھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ لہذا فیصلہ یہی طے ہوا کہ فی الحال گھر والوں سے چھپ کر نگار سے شادی کر لی جائے اور کچھ عرصہ اس رشتے کو مخفی رکھا جائے۔ اس وقت مقبول کا ارادہ یہی تھا کہ کسی مناسب موقع پر یہ راز والدین کے سامنے کھول دیں گے لیکن وہ مناسب موقع کبھی نہ آیا۔ اگلے سال نتیجہ آنے سے پہلے ان کے والد کی طبیعت کچھ یوں بگڑی کہ مقبول کو سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگنا پڑا جہاں مقبول کے والد نے پہلے ہی سے اپنے بھائی کی بیٹی سے ان کا رشتہ جوڑنے کا انتظام مکمل کر رکھا تھا۔ مقبول کے والد کی حالت کے پیش نظر انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور شادی کے ٹھیک تیسرے دن والد اگلے جہاں سدھار گئے اور ٹھیک اسی دن زریاب تین ماہ کی ہوئی۔ چالیسویں کے بعد جب مقبول نے تنہائی میں اپنی ماں کو نگار اور اپنی بچی کے بارے میں بتایا تو وہ بھی صدمے سے بے حال ہو کر بستر پر پڑ گئیں اور پھر انہوں نے قسم ہی کھالی کہ جب تک مقبول اس چھوٹے گھر کی لڑکی نگار سے ہر رشتہ توڑ نہیں لیتے تب تک وہ انہیں اپنا حق نہیں بخشیں گی اور یوں ایک عورت نے اپنے حق کی بخشش کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح دوسری عورت کے حق پر ڈاک ڈال دیا۔ نگار کو جب طلاق کا پروانہ ملا تو وہ نیم پاگل سی ہو گئی۔ حالانکہ مقبول نے اپنی کمال آباد والی کو بھی اور ماں اور بچی کی تربیت اور گزارے کے لیے بہت مقبول انتظامات کر دیئے تھے لیکن ہوش میں آنے کے بعد نگار نے اس بے وفا کی دی ہوئی ہر سہولت اور آسائش کو ٹھکرا دیا۔ کئی سال بیت گئے اور زریاب کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن زہرا بھی جوان ہو گئی لیکن مقبول کی دوسری شادی اور طلاق کا راز راز ہی رہا۔ لیکن پچھلے ہفتے جب حاجی مقبول کو تیسرا دل کا دورہ پڑا تو انہیں اپنی ماضی کی غلطیاں یاد آئیں اور انہوں نے اس جان لیوا بیماری کے بستر پر ہی زہرا کی ماں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ زہرا کی ماں تو کھل کر اپنے اندر ہوئی ٹوٹ پھوٹ اور کرچیوں کے شور کو بھی باہر نہیں نکال پائیں کیوں کہ ان کے سہاگ کی حالت ہی اس وقت کچھ ایسی تھی کہ انہیں اپنے پھٹتے ہوئے دل کی آخری سسکی کو بھی پی جانا پڑا۔ ہاں البتہ ماں نے تنہائی میں زہرا کے سامنے اپنے دل کے سارے سیلاب بہا دیئے۔ حاجی مقبول کی خواہش پر ہی زہرا اور اس کی ماں کمال آباد آئے تھے تاکہ نگار سے مقبول کی خواہش کے پیش نظر اس کی زیادتی کو درگزر کرنے کی درخواست کر سکیں۔ خود حاجی مقبول تو بستر سے کچھ ایسے لگے پھر دن بدن ان کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ نگار نے وہی کیا جو کوئی اعلیٰ ظرف کر سکتا ہے لیکن اس نے زہرا کی ماں کے ساتھ شہر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ پھر سے پرانے زخم ہرے نہیں کرنا چاہتی تھیں اور دیسے بھی وہ خود بہت سی الجھنوں میں گھری ہوئی تھیں۔ یہ کاسی حویلی پہلے ان کے دادا اور پھر باپ کی واحد اور آخری جاگیر تھی۔ لیکن دو سال پہلے زریاب کے نانا کے انتقال کے بعد اب زمانے کے گدھ ان کی اس پشتی جانیسدا اور بیٹی پر نظریں گاڑھے بیٹھے اور وہ کسی بھی حال میں اپنے اس آخری خزانے کی حفاظت سے غافل نہیں رہ سکتی تھیں۔ ان کی حالت کے پیش نظر ہی زہرا کی امی نے اسے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ زریاب اور اس کی ماں کی زندگی کا سب سے بڑا کاٹنا شہر کا مشہور غنڈہ جگن تھا۔ جو بیک وقت کوئل زریاب اور کمال آباد کے وسط میں کھڑی اس کی جانیسدا کو ہتھیانے



کے درپے تھا اور جگن اس سلسلے میں ہر ہتھکنڈ پہلے ہی آزمایا چکا تھا۔ میں نے زریاب اور نگار کو اطمینان دلایا کہ مجھ سے جو ممکن ہوا، ضرور کروں گا۔ فی الحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ جگن کو علاقہ پولیس نے نقص امن کے خدشے میں مہینہ بھر کے لیے شہر بدر کیا ہوا تھا اور فی الحال اس کی طرف سے ماں بیٹی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس رات میں نے پایا اور کاشف کو جو تار اور خط بھیجے تھے وہ اسی مسئلے سے متعلق تھے کہ کمال آباد میں پولیس کی اعلیٰ قیادت کو کاسنی حویلی کی حفاظت کرنے کی درخواست کی جائے۔ میں جانتا تھا کہ کاشف تب تک تک کر نہیں بیٹھے گا جب تک سارا انتظام مکمل نہیں کر لے گا اور پایا کا تو آئی جی پولیس کو ایک فون ہی کافی تھا۔ کہتے ہیں انسان ہی انسان کا سب سے بڑا اور داور انسان ہی اس کا درماں ہے۔ لیکن فی الحال جگن کاسنی حویلی کا در و دریا ہو رہا تھا۔ تیسرے دن ہی مجھے نگار کا پیغام ملا کہ جگن کمال آباد واپس پہنچ گیا ہے۔ اے ایس پی خالد نے اسے تھانے بلوا کر پہلے ہی سرزنش کر تو دی ہے کہ وہ دوبارہ کاسنی حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے لیکن وہ اب بھی بے حد فکر مند تھیں اور زریاب کا تو اب جگن کا نام سنتے ہی رنگ پیلا پڑ جاتا تھا۔ میں دو دن پہلے سلطان بابا کے لیے بذریعہ تار پیغام بھیجا چکا تھا کہ مجھے کمال آباد میں ان کی اشد ضرورت ہے لہذا وہ کسی بھی طرح کمال آباد پہنچیں۔ نہ جانے پرانی درگاہ پر بھیجے گئے تار کا پیغام ان تک پہنچا تھا، یا نہیں لیکن اب میرے لیے مزید دیر کرنا ممکن نہیں تھا لہذا میں تمام ذمہ داریاں اصغر صاحب کے حوالے کر کے کمال آباد کی گاڑی پکڑنے نکل پڑا۔

”کاسنی حویلی“ پر وہی سدا پرانی یاسیت طاری تھی۔ اس شام عصر کے وقت جب میں وہاں پہنچا تو مجھے پوری حویلی میں پھولوں سے بھری کیاریوں اور ان کی نہات سلیقے سے کی گئی تراش خراش کے پیچھے پیچھے ہنرمند ہاتھوں کا بھی پتا چل گیا۔ زریاب نہایت انہماک سے بڑا سا قینچہ ہاتھ میں لیے پھاٹک سے متصل کیاری کی کاسنی پھولوں کی تیل سے بے جان ڈالیاں اور خشک پتیاں اور شہنشاہی تراش رہی تھی۔ شاید یہی اس پر زمرہ سے ماحول میں اس نازنین کا واحد پہلا وہ تھا۔ تبھی وہ اس کام میں اس قدر مگن تھی کہ اسے میری آمد کی خبر تک نہیں ہوئی۔ کچھ لمحوں بعد میں نے ہلکے سے کھٹکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ گھبرا کر یوں ہلٹی کہ اس کے چہرے کا رنگ بھی انہیں پھولوں کی طرح کاسنی سا ہو گیا۔ وہ جلدی سے مجھے سلام کر کے اندر چلی گئی اور چند لمحوں بعد نگار اندر سے برآمد ہوئیں۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ پتا چلا کہ جگن نے خود تو پہرے کی وجہ سے حویلی کا رخ نہیں کیا لیکن اس نے اپنے ہر کاروں کے ذریعے نگار کو یہ واضح پیغام بھیجا ہے کہ وہ کسی طور پر زریاب سے دست بردار نہیں ہوگا اور یہ چند روزہ پہرہ اس کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتا۔ زریاب جہاں بھی جائے گی وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ہی لگا رہے گا۔ مجھے نگار کے چہرے سے ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ یہ معاملہ پولیس، یا پہرے داری سے کہیں بڑھ کر تھا اور پھر پولیس کے سادہ لباس والے اہلکار بھی کب تک یوں کاسنی حویلی کے پھاٹک پر ٹنگے رہیں، یا پھر نگار اور زریاب کے پیچھے پیچھے بازار اور دیگر روزمرہ کے آنے جانے کی جگہوں پر دم چھلا بنے پھرتے رہیں.....؟ معاملہ عورتوں کا تھا اور عورت کا پہرہ بذات خود ہمارے معاشرے میں ہزار سوالوں کو جنم دے ڈالتا ہے۔ کیوں کہ ہم عورت کو پچاس فیصد قصور وار تو ازل سے ہی تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ باقی کسر شک کا پانچ، یا دس فیصد پورا کر دیتا ہے اور معاشرہ اس کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے۔ نگار اور زریاب اور پولیس کے پہرے کی یہ ہم راہی بھی تو ایک طرح سے جگن ہی کے اس مقصد کی تکمیل تھی جو وہ زریاب کو بدنام کر کے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شرفا تو ویسے بھی اس در سے سو قدم دور چلتے ہیں جہاں ان وردی والوں کا پہرہ ہو اور اس پہرے میں اگر وہ دونوں باہر بھی نکلتیں تو یہ مزید

جگ ہنسائی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع دینے کے مترادف ہوتا اور پولیس جگن پر اس وقت تک ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتی تھی جب تک وہ کوئی باقاعدہ جرم نہ کرتا۔ وہ پہلے ہی علاقہ بدری کی سزا کاٹ کر آیا تھا اور اے ایس پی خالد اگر اسے کسی بہانے سے دوبارہ جیل بھجواتا، یا پھر سے علاقہ چھوڑنے کا حکم دے بھی دیتا تو اس کی میعاد کیا ہوتی؟ اور پھر کسی بھی دسرے درجے کے وکیل کے ذریعے مجسٹریٹ صاحب کی عدالت سے پولیس کے اس حکم کے خلاف انٹنامی پر چد لیا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ بہر حال عدالت کسی بھی شخص کو صرف اس وجہ سے سزا نہیں دے سکتی تھی کہ اس کی ذات سے دو کمزور اور معصوم عورتیں خوف زدہ ہیں۔ دھمکی ثابت کرنے کے لیے نگار کو عدالت کے پھیرے کاٹنے پڑے اور زریاب کا دامن بھی الجھنے سے بچ نہ پاتا۔ جب کہ یہ سارا بکھیرا ہی زریاب کے اجلے دامن کو کسی بھی ایسے داغ سے بچانے کے لیے ہی کھڑا کیا گیا تھا۔ بات اگر کسی عفت مآب و شیئہ کی ہو تو یہ معاشرہ ہر طرف سے ایک دلدل ہی تو ہے۔ تھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری کی زد میں آئے، نتیجہ تو ایک ہی تھا۔ دفعۃً مجھے محسوس ہونے لگا کہ جگن کے معاملے میں پولیس کو ڈال کر ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ اب یہ معاملہ پسند، یا لالچ سے بڑھ کر ضد اور انا کی سولی بن چکا تھا جس پر جگن، یا زریاب میں سے کسی ایک کو لٹکانا ہی تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ نگار سے کہوں کہ وہ اپنا اور زریاب کا چھوٹا موٹا سامان باندھیں اور میرے ساتھ اسی وقت جیل پور کے لیے نکل چلیں۔ ابھی روشنی باقی تھی اور ہم رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے جیل پور پہنچ سکتے تھے۔ اگر جگن نے ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کی تو پھر دیکھا جائے گا اور پھر جیل پور میں خان صاحب کی پوری حویلی موجود تھی ان دو مظلوم عورتوں کے سر پر سایہ کرنے کے لئے۔ لیکن اگر کاسنی حویلی سے دست برداری ہی اس مسئلے کا حل ہوتا تو نگار خود بہت پہلے ایسا کوئی قدم اٹھا چکی ہوتیں۔ میں کافی دیروہیں کھڑا اس معاملے کے بیچ ڈم پر غور کرتا رہا۔ اچانک میں نے نگار کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو کر سفید ہوتے ہوئے دیکھا میں نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں بیچے حویلی کے پھاٹک کی جانب دیکھا۔ ایک بھاری تن و توش اور گہرے سانولے رنگ کا ایک شخص سر پر ترچھی قرقلی پہنے، ہونٹوں میں بیڑی اور گللوں میں پان دبائے ہوئے تانگا حویلی کے پھاٹک پر کوائے ہمیں گھورتا تھا۔ نگار کے منہ سے سرمراتی ہوئی آواز میں صرف اتنا نکلا..... جگن.....

وہ شخص کچھ دیر تک ہمیں یونہی گھورتا رہا۔ پھر اس نے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگا آگے بڑھ گیا اور پھر ایک دوسری لیکن انتہائی خوشگوار حیرت اسی لمحے کے جلو میں میری مایوسیوں اور ناامیدیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے نمودار ہو گئی۔ تانگا بڑھتے ہی میں نے اس کے عقب میں ایک سائیکل رکشہ کورکتے اور اس میں سلطان بابا کو اترتے ہوئے دیکھا۔ چند لمحے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ کمال آباد اور پھر کاسنی حویلی پہنچ چکے ہیں اور اس وقت عین میرے سامنے کھڑے میرے چہرے سے بے اختیار بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہے ہیں۔ نگار اور زریاب سلطان بابا کے لیے چائے وغیرہ کے انتظامات میں لگ چکی تھیں۔ میں نے سلطان بابا کو چند لمحوں میں ہی ساری کہانی ”الف“ سے لے کر ”سی“ تک سنا ڈالی، جسے سن کر وہ کافی دیر کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر بہت دیر بعد سر اٹھا کر بولے ”کمال آباد کے آئی جی صاحب سے پرانی یاد اللہ ہے مجھے ان سے ملنا ہوگا.....“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ میں انہیں اس بات سے منع کر دوں یہ پولیس، یا قانون کا معاملہ نہیں تھا۔ مانا کہ آئی جی صاحب سارے ضلع کی کوتوالی جگن کے دروازے پر لاٹھا نہیں گئے لیکن اس سے بھی کیا ہوگا۔ وہ بھی جگن کو عمر بھر کے لیے تو قید نہیں کر پائیں گے نا..... یہ تو اس کے دل میں پلٹے کینے کو مزید بڑھاوا دینے کے مترادف ہوگا۔ لیکن چاہ کر بھی میں سلطان بابا کو یہ سب نہیں کہہ پایا اور سلطان بابا کے



ساتھ اگلی صبح آئی جی صاحب کے دفتر جا پہنچا۔ ملاقات کا وقت صبح گیارہ سے بارہ بجے کا تھا اور ملاقاتیوں کی بھیڑ دیکھ کر کم از کم اگلے تین دن تک اپنا نمبر آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال میں نے قاعدے کے مطابق کاغذ کی ایک چٹ پر سلطان بابا کا نام لکھ کر استقبالیہ کلرک کو دے دیا جو دس پندرہ منٹ کے وقفے سے جمع شدہ ناموں کی پرچیاں اندر آئی جی صاحب کے پی اے کو بھجوا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ اندر سے کچھ عمر کے ایک صاحب جلد بازی میں برآمد ہوئے ان کی وردی پر گلے فیتوں سے زیادہ ان کی شخصیت شاندار تھی۔ ان کے پیچھے ہی باوردی اسٹاف، پولیس والے گارڈ اور چند اور عملے کے آدمی ہڑبڑاتے ہوئے تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ جس راہ داری میں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہاں بھی کھلبلی ہی مچ گئی۔ پتا چلا کہ یہی صاحب آئی جی نصیر احمد ہیں۔ وہ سبھی لوگوں سے لاطعلق تیر کی طرح ہماری جانب بڑھے اور گرم جوشی سے سلطان بابا کے گلے لگ گئے اور انہیں بڑی عزت اور محبت سے اندر اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں حیرت سے ان کی یہ ساری گرم جوشی دیکھتا رہا۔ دونوں نہ جانے کن کن زمانوں کی پرانی یادوں کو کافی دیر تک کریدتے رہے۔ نصیر صاحب کو بہت دیر بعد میرا خیال آیا اور انہوں نے مجھ سے معذرت کی کہ ان کی سلطان بابا سے بہت مدت بعد ملاقات ہوئی ہے لہذا جذبات کی رو میں وہ میرا تعارف لینا بھول ہی گئے۔ ابتدائی تکلفات سے فارغ ہونے کے بعد اب مدعا کی باری آچکی تھی لیکن میں سلطان بابا کی فرمائش سن کر کچھ حیران ہوا۔ انہوں نے آئی جی صاحب سے بگن کو ان کے آفس طلب کرنے کی فرمائش کی۔ نصیر صاحب نے چونکہ کر سلطان بابا کو دیکھا۔ ”کوئی خاص شخصیت.....؟“ جہاں تک میری معلومات ہیں، اس نام کا اس شہر میں ایک بدنام زمانہ ناچکا اور لنگر بٹتا ہے..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“ سلطان بابا مسکرائے۔ ”سب ٹھیک ہے نصیر صاحب..... بس یہ دھیان رہے کہ آپ کے عملے میں سے جو بھی جائے، اسے میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں تک لے کر آئے.....“ اس مرتبہ نصیر صاحب کے ساتھ ساتھ میری بھی چونکنے کی باری تھی۔ آئی جی صاحب نے سلطان بابا سے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور فون پر کسی کو ہدایات جاری کر دیں کہ بگن کو عزت کے ساتھ ان کے دفتر پہنچا دیا جائے۔ میں ایک بار پھر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں پی اے نے انٹرکام پر بتایا کہ بگن کو لایا جا چکا ہے۔ آئی جی صاحب نے اسے وہیں آفس میں بھیجنے کی ہدایت کر دی۔ کچھ ہی دیر میں بگن کمرے میں داخل ہوا۔ بگن جیسے غنڈے کے لیے آئی جی آفس میں طلب کیا جانا بذاتہ خود اس کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ اسے آج تک حوالدار سے لے کر سب انسپکٹر تک ہی جھگڑتے آرہے تھے، جو کہیں نہ کہیں خود بھی بگن سے مرعوب ہی رہتے تھے۔ کوئی بڑا کیس ہو گیا تو انسپکٹر، یا ایس ایچ او آفس میں پیشی ہو جاتی تھی جہاں چھوٹے اہلکاروں کی خوشامد اور بڑے اہلکاروں کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ کا وہ عادی تھا اور وہاں کے بلاوے اس کے لیے اب صرف تفریح کا باعث ہوتے تھے۔ لیکن ایک دن اسے یوں آئی جی آفس میں طلب کیا جائے گا یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قماش کے لوگ اسے اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتے تھے اور آئندہ ان کے ”دھندے“ میں یہ بلاوہ ان کی ساکھ بڑھانے میں کافی معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن بہر حال آئی جی کا بلاوہ اور پھر نصیر صاحب کی شخصیت اور ان کے دفتر کا وہ رعب دار ماحول..... یہ سب مل کر کسی بھی غلط انسان کے حواس کچھ دیر کے لیے معطل کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس دن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بعض مرتبہ عہدے سے بڑھ کر انسان کا سراپا بولتا ہے۔ نصیر صاحب کی بھاری بھر کم شخصیت اور ان کے اندر تک اتر جانے والی وہ گہری نظر کسی بھی چھوٹے موٹے مجرم کا پتا پانی کر سکتی تھی۔ لیکن بگن بہر حال علاقے کا دادا اور ایک گھاگ شخص تھا

جسے کئی بار جیل یا تارا کے بعد قانون کی اتنی سمجھ تو آ ہی چکی تھی کہ فی الحال اس نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کی بنیاد پر اسے کوئی سزا دی جائے اور اپنے بلاوے سے لے کر آئی جی آفس پہنچنے تک وہ اپنے حواس پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے سرد مہم کے باوجود دفتر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک کے مختصر عرصے میں وہ دو تین بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ چکا تھا۔ نصیر صاحب نے سر سے پیر تک ایک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی ”ہوں..... تو تم ہو جگن.....؟ ماں باپ نے کیا نام رکھا تھا؟“ وہ کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ ”جی..... جہانگیر.....“ سے ہوتے ہوئے جگن پڑ گیا۔

صاحب..... میرے کو یہاں.....؟“ نصیر صاحب نے اس کا سوال منقطع کرتے ہوئے سلطان بابا کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ سلطان بابا ہیں..... میرے خاص مہمان..... یہ تم سے ملنا چاہتے تھے.....“ سلطان بابا نے آئی جی صاحب سے درخواست کی کہ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم ان کے کمرے کے ساتھ ملحقہ ملاقاتی کمرے میں جگن سے بات کر لیں..... ویسے بھی ہماری وجہ سے ان کے دفتر کے معمولات میں پہلے ہی کافی خلل پڑ چکا تھا۔ نصیر صاحب نے خوش دلی سے سر ہلایا اور چند لمحوں بعد ہم جگن کے سامنے ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حالانکہ گزشتہ روز جگن کی مجھ پر کاسنی حویلی کے دالان میں کھڑے ایک اچنتی سے نگاہ تو پڑ چکی تھی لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ مجھے پہچان نہیں پایا۔ اب اس کا چہرہ باقاعدہ ایک سوالیہ نشان بن چکا تھا لیکن جانے یہ سلطان بابا کا ٹھہرا ہوا لہجہ تھا، یا پھر اس ماحول کا اثر کہ وہ چاہے کبھی ہم سے کوئی سوال نہیں کر سکا۔ سلطان بابا نے شاید جان بوجھ کر کچھ زیادہ وقت لیا اور پھر دھیرے سے کھڑک کر بولے۔ ”معافی چاہتا ہوں جہانگیر میاں..... تمہیں اس طرح یہاں بلوا کر زحمت دی۔ اگرچہ یہاں سے کوئی نوکری کے پاس جانا چاہئے، لیکن تمہارے پتے ٹھکانے سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے کنویں کو پاس بلانا پڑا..... حالانکہ غرض ہماری ہی تھی.....“ جگن جو پہلے ہی سلطان بابا کے منہ سے اپنا اصل نام سن کر ہڑبڑایا سا ہوا تھا، ان کی بات سن کر بالکل ہی بوکھلا سا گیا۔ ”نہیں نہیں بابا جی..... آپ کام بولو.....“ سلطان بابا کچھ دیر جیسے سوچ میں پڑ گئے پھر سر اٹھا کر بولے ”نہیں..... یہاں کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا..... تم اپنا پتا دے دو..... میں اپنی درخواست لے کر وہیں حاضر ہو جاؤں گا.....“ میں نے حیرت سے بابا کی طرف دیکھا، یہ کیا بات ہوئی.....؟ بھلا اس شہر میں جگن جیسے بدنام زمانہ کا پتا ڈھونڈنا کون سی مشکل بات تھی.....؟ اور پھر اگر ہمیں اس کے گھر جا کر یہ بات کرنی تھی تو پھر اسے یہاں آئی جی آفس بلوانے کے لیے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی.....؟ خود جگن کے لیے بھی سلطان بابا کی یہ بات کسی اچانک پھٹنے والے پٹاخے سے کم نہیں تھی۔ انتظار بھی تو ایک طرح سے اعصاب کا امتحان ہوتا ہے اور وہ دوبارہ اس پل صراط سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی کہ سلطان بابا اپنی بات وہیں کہہ ڈالیں لیکن سلطان بابا بھی شاید اس کے گھر کی زبانت کا تہیہ کر کے ہی یہاں تک آئے تھے۔ سو آخر کار جگن کو ہی ہار ماننا پڑی اور بے دلی سے اس نے مجھے اپنے گھر کا پتا لکھوا دیا۔ نصیر صاحب کے دفتر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے چلتے چلتے ان سے کوئی بات کہی جسے میں آگے نکل جانے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے نہیں سن پایا۔ راستے بھر سلطان بابا خاموش رہے اور کاسنی حویلی پہنچ کر بھی میں نے حسب معمول ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ جو بھی مجھ سے وہ جلد ہی کھل جائے گا۔ شام چار بجے حویلی کے پھاٹک سے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں پھرتی لمبی سی تسبیح سیٹی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”چلو میاں..... ذرا جہانگیر کے ہاں ہو آئیں۔“ انہوں نے جب سے جگن کا اصلی نام سنا تھا وہ اس کے تذکرے میں وہی نام لے رہے تھے۔ جب ہم حویلی سے باہر نکلے تو میں باہر آئی جی



صاحب کی سرکاری موٹر کار کھڑی دیکھ کر زور سے چونکا۔ گاڑی کے ساتھ ہی باوردی شوفر اور چاق و چوبند محافظ کو دیکھ کر میری حیرت دو چند ہو گئی۔ آخر اس کو دفتر سے جگن جیسے غنڈے کے گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر سلطان بابا تو ایسے دکھا دوں سے ہمیشہ ہی اجتناب برتتے تھے پھر آج یہ سب کچھ کیوں.....؟ میں انہی سوچوں میں گم تھا جب گاڑی نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم ایک پس ماندہ سے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں کچی گلیوں کی مٹی میں اٹے بچوں نے کچھ دیر تک ہماری گاڑی کا پیچھا کیا اور پھر تھک کر حسرت بھری نگاہوں سے دھول اڑاتی گرد کا حصہ بنتے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ڈرائیور کو ہماری منزل کا بخوبی اندازہ تھا کیوں کہ اس نے راستے میں ایک بار بھی ہم سے کوئی تصدیق نہیں چاہی اور گاڑی سیدھی جگن کے بتائے ہوئے پتے پر ہی جا کر روکی۔ تب تک گلی کے تمام لوگ چونکے ہو کر حیرت اور کچھ خوف سے آئی جی صاحب کے محافظ کو ہمارے لیے دروازے کھولنا دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے بھی یہ جگن کی طرح ایک انہونی تھی کیونکہ آج تک انہوں نے زیادہ سے زیادہ کسی سب انسپکٹر، یا ایس ایچ او کو جگن کے دروازے پر مغلظات بکتے، یا کاغذ کے چند ٹکڑے مٹھی میں دبائے نظریں چرا کر جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس طرح لمبی چوڑی سرکاری گاڑی میں سے ایک بزرگ درویش اترتا وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے جو جگن کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں بھی دے رہا تھا۔ خود جگن کی اپنی سینی گم لگ رہی تھی اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہمارا استقبال کیسے کرے۔ آئی جی صاحب کا ہمارے ساتھ پرپاک سلوک وہ دیکھ چکا تھا اور اب ہمیں ان کی گاڑی سے اترنا دیکھ کر تو جیسے اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔ اس نے آج تک لوگوں کو خود سے ڈر کر نفرت سے بھاگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ یہ اس کے لیے بھی ایک بالکل نیا تجربہ تھا کہ کوئی خود اس کا مہمان بننے کے لیے اس کے گھر کی دہلیز پار کر کے اس کے کچے اور بوسیدہ صحن سے گزرا ہے۔ گھر میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ جگن کے چند ہرکارے کچھ ہی دیر میں لپک کر کسی قریبی ٹیکری سے چائے کے کچھ لوازمات پکڑ لائے اور ان کی آنکھوں اور حیرت آمیز نگاہوں کے درمیان ہمیں چائے بھی پیش کر دی گئی۔

خود میں بھی نہایت اچنبھے سے سلطان بابا کو یوں مزے سے چائے پیتا دیکھ رہا تھا جیسے ہمارا واحد مقصد ہی یہاں آ کر جگن کی گلی کے ٹکڑ والے ہوٹل کی تیز چینی والی چائے پینا ہو۔ کچھ ہی دیر میں وہ جگن کے خاندان کی ساری تاریخ معلوم کر چکے تھے۔ جگن بچپن سے ہی یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا اور پھر چودہ سال کی عمر میں اس نے وہ سرکاری یتیم خانہ بھی چھوڑ دیا اور تب سے مہینے کا ایک آدھ ہفتہ وہ کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں جیل میں گزارنے لگا۔ رفتہ رفتہ علاقے میں اس کی دھاک بٹیشتی گئی اور چھوٹے موٹے چوراہے اس کے گردہ میں شامل ہوتے گئے اور وہ علاقے کا سب سے بڑا ادا بننا گیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد سلطان بابا نے پیالہ میز پر رکھا اور براہ راست جگن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ”جہانگیر میاں..... تمہاری اتنی شہرت سنی تھی، تجھی اپنی ایک قیمتی چیز تمہارے پاس بطور امانت رکھنے چلا آیا ہوں اور یاد رہے..... یہ کام پولیس، یا کوٹوالی کے بس سے باہر کا ہے۔ امید ہے مایوس نہیں کرو گے۔“ جگن گڑبڑا سا گیا۔ ”لیکن آپ تو خود..... میرا مطلب ہے..... اچھا آپ بولو تو سہی..... میرے بس میں ہوا تو ضرور..... کیوں نہیں.....“

سلطان بابا کی نظریں اب بھی جگن پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔ ”کاسی حویلی کی ایک مینا ہے..... اپنی بیٹیا جیسی ہے..... زریاب..... اسے بطور امانت تمہاری تحویل میں سوپنا ہے..... بولو..... کر سکو گے اس کی حفاظت.....؟؟؟.....“ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گھمبیر سنائے میں کسی نے کوئی کان

بھاڑ دینے والا دھماکا کر دیا ہو۔ جگن تو بکھلا کر کھڑا ہوا ہی چکا تھا۔ خود میرے کان بھی سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ سلطان بابا نے جگن سے براہ راست بات کرنے کے بجائے اتنا لبا راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اگر یہ درخواست وہ سیدھے راستے آ کر جگن کے سامنے پیش کرتے تو یقیناً وہ ہماری التجا کو بھی اسی طرح فہمی میں اڑا دیتا جیسے ہر کمزور کی فریاد کا انجام ہوتا آیا ہے۔ سلطان بابا نے صبح ہی جگن کو یہ باور کروا دیا تھا کہ ان کی ڈوری کہاں کہاں بندھی ہوئی ہے۔ پھر انہوں نے شام تک کا وقت لے کر جگن کو خود کو اور انہیں مزید تولنے کا موقع بھی فراہم کر دیا اور پھر اب شام کو پولیس کے سب سے اعلیٰ عہدے دار کی گاڑی میں پوری شان و شوکت کے ساتھ جگن کے دروازے پر اتر کر انہوں نے جگن کے حوصلوں پر آخری کاری ضرب بھی لگا دی تھی اور اس ساری تمہید کا مقصد جگن کو صرف اتنا ہی احساس دلانا تھا کہ اس کے مقابل اتنا وزن رکھتے ہیں کہ اگر چاہیں تو وقت پڑنے پر ہماری حکومتی مشینری اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں لیکن ان کی آخری بات اور عاجزانہ درخواست نے جگن پر یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ آنے والوں کے ظرف کا پیمانہ اس کے اندازوں سے کہیں زیادہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ اس کی دہلیز پار کرنے سے پہلے ہی اپنے ہتھیار باہر میدان میں پھینک آئے ہیں، حالانکہ وہ چاہتے تو ان ہتھیاروں کی بدولت وہ یہ جنگ جیت بھی سکتے تھے۔ لیکن سلطان بابا کا مقصد جنگ کبھی تھی ہی نہیں..... وہ تو بس عاجزی ہی جانتے تھے۔ لہذا انہوں نے جگن کو درپردہ یہ احساس بھی دلادیا کہ اگر وہ اپنے شرانگیز ارادوں سے باز نہ آیا تو بد لے میں ان کے پاس زریاب کو کاسنی حویلی سے کہیں دور لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کیوں کہ معاملہ ایک پروہ نشین کی حرمت کا ہے اور یہ وہ دودھاری تلوار تھی کہ جس کا شکار ہر حال میں وہ پریوش ہی تھی۔ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے چپ ہو چکے تھے اور جگن کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں اس وقت نہ جانے کتنے طوفان اور آندھیوں کے جھکڑ اپنی چیخوں سے اٹھل پھل مچا رہے تھے۔ وہ اسی طرح گم صم سا اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا تھا اور اس پاس منڈلاتے اس کے ہر کارے بھی دم سادھے اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک ماحول پروہ اعصاب شکن خاموشی طاری رہی۔ سلطان بابا نے اٹھ کر جگن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اگر میری مانگ بہت بڑی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں میاں.....“ جگن کا جسم ذرا دیر کے لیے لرز سا گیا۔ میں بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ ہوا جو یہاں کے باسیوں کے لیے دیکھ پانا کبھی ممکن نہ تھا۔ جگن کو آج تک کسی نے زندگی بھر کبھی اتنی عزت اور پیار سے نہیں پکارا تھا۔ عزت تو دور کی بات کسی صاحب اختیار نے اس سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ سلطان بابا نے اس کے لرزتے شانوں پر ہاتھ کیا رکھے کہ اس کے اندر کا دس بارہ سالہ وہ یتیم بچہ کو دکھ باہر نکل آیا جسے آخری بار اسی محلے کی مسجد کے پیش امام نے سر پر ہاتھ پھیر کر عادی تھی جگن کے فولادی جسم نے دو چار ہچکیاں لیں اور پھر وہ جامد برف کا پہاڑ کچھ یوں ٹوٹ کر پگھلا کہ اس پاس سب ہی جل تھل ہو گیا۔ اس کے کارندے اپنے استاد کو یوں بچوں کی طرح آنسو بہاتے دیکھ کر پہلے تو اس کی جانب دوڑے اور چاہا کہ لپک کر اسے سنبھال لیں لیکن اب اس پھرے دریا کے آگے بند باندھنا ان میں سے کسی کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ نتیجتاً کچھ دیر بعد خود ان میں سے بھی چند اپنی آنکھیں پونچھنے نظر آئے۔ سچ ہے کہ شاید ”آنسو بہترین کفارہ ہے۔“ سلطان بابا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی اور جس وقت جگن ہمیں رخصت کرنے کے لیے اپنی گئی میں آیا تب تک اس کا اپنے آنسوؤں سے دھلا ہوا چہرہ یہ صاف بتا رہا تھا کہ اب کمال آباد میں کاسنی حویلی کا اگر کوئی سب سے بڑا محافظ ہوگا تو وہ خود جگن ہی ہوگا۔ اب یہ طرف سے طرف کا سودا بن چکا تھا اور آج تک اس برے انسان کے اندر کے ظرف کو تولنے کے لیے کسی نے اپنا ترازو یوں پیش ہی نہیں کیا تھا اور آج جب کسی صاحب ذوق نے اسے خود کو اس کانٹے پر پرکھنے کا موقع فراہم کیا تو اس کے من کے اندر جیسی کان